سلسلۂ مطبوعات نمبر ۱۸۸

ملک ملک کی لوک کہانیاں

مترجم
ریاض جاوید

کتاب منزل۔ لاہور

(جملہ حقوق محفوظ)

مترجم .... ریاض جاوید
طابع .... شیخ نیاز احمد
مطبع ...... علمی پرنٹنگ پریس ہسپتال روڈ۔ لاہور
ناشر .... کتاب منزل۔ لاہور
اشاعت .... اوّل

ترتیب

ایشیا

۱ جاپان:- ۱۱
وشنو ۱۱
اور اشماتارو کی حیاتِ جاوداں ۱۷
بلّی کا اغوا ۲۷
۲ بھارت:- ۳۳
بندر اور ریچھ ۳۵
بلّی اور گدھا ۴۰
۳ چین:- ۴۵
لوسون - ایک نابینا لڑکا ۴۷
ایک لڑکا جو شہنشاہ بنا ۵۷
۴ عرب:- ۷۱
سونے کا طشت اور کتّا ۷۳
۵ جارجیا:- ۸۱
ایک سانپ اور کسان ۸۳

	یورپ :-	
۶	قدیم یونان :-	۸۹
	سائیکی	
۷	جدید یونان :-	۹۱
	پادری کی احمق بیٹیاں	۱۰۴
۸	ہنگری :-	۱۱۱
	جپسی اور شیطان	۱۱۳
۹	فرانس :-	
	حسن اور درندہ	۱۱۹
۱۰	جرمنی :-	۱۵۱
	تین بھائی	۱۵۳
	تکسی	۱۵۷
۱۱	بوہیما :-	۱۶۵
	عقل اور قسمت	۱۶۷
۱۲	ڈنمارک :-	۱۷۵
	نیکی کا بدلہ	۱۷۷
۱۳	اسپین :-	
	ناگن	۱۸۵
۱۴	افریقہ :-	۲۰۵
	گیدڑ اور خشک سالی	۲۰۷
۱۵	امریکہ :-	۲۱۵
	وعدہ خلافی	۲۱۷
	روحوں کا جزیرہ	۲۲۳

تعارف

کہانی کے لفظ میں ایک جادو ہے، جو ہر چھوٹے بڑے پر اثر کرتا ہے۔ کہانی جب بھی تھی کہ دنیا تہذیب و شائستگی اور شہریت و مدنیت کے تصوّر سے قطعی ناآشنا تھی۔ اور کہانی اب بھی ہے کہ تہذیب و شائستگی اور شہریت و مدنیت اپنے انتہائے کمال کو پہنچ کر پھر وحشت و بربریت کی طرف رُخ کر رہی ہے۔ اور بڑھتی ہوئی وحشت و بربریت میں انسان کا دل ایک بار پھر زندگی کی اُسی سادگی اور معصومیّت کے لیے بے تاب اور بے قرار نظر آرہا ہے، جو مہذّب و متمدّن بننے سے پہلے اس کا حصّہ تھی۔ سادگی اور معصومیّت کے اِس تصوّر میں ایک عجیب طرح کی لذّت اور عجیب قسم کا سرور ہے۔

سادگی اور معصومیّت کو پھر زندگی پر قابض اور حکمراں دیکھنے کی خواہش نے ادب میں بھی نئے نئے رُوپ دکھلائے ہیں۔ لوک کہانی اِنہیں رُوپوں میں سے ایک رُوپ ہے ——— سادہ اور معصوم، لیکن موثر اور دل نشین۔

لوک کہانی انسانی زندگی کے ہر عہد میں اپنی سادگی اور معصومیّت کی وجہ سے ممتاز رہی ہے۔ اس نے فطرت کے حُسن اور انسان کی بے لوث

سادگی کو اپنا محور و مرکز بنایا اور ہر حال میں اپنے آپ کو اسی سے وابستہ رکھا۔ لیکن جو چیز لوک کہانی کو سادگی اور معصومیت کی صفت کے علاوہ، دوسری طرح کی کہانیوں سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ اُس کا مقامی رنگ ہے۔ ہر لوک کہانی ایک خاص ماحول، ایک خاص مزاجی کیفیت، ایک خاص تہذیبی روایت، ایک خاص انداز فکر و نظر اور ایک خاص اسلوبِ اظہار کی حامل ہوتی ہے۔ اور یہ خاص ماحول، یہ خاص مزاج، یہ خاص تہذیب اور روایتی رنگ اور یہ خاص اسلوب صرف ایک ہی اجتماعی زندگی اور ایک ہی سرزمین کی کہانیوں میں مل سکتا ہے۔ کہیں اور نہیں مل سکتا۔ جاپان کی لوک کہانی کی بات چین کی لوک کہانی میں اور جرمنی کی لوک کہانی کی بات فرانس کی لوک کہانی میں ملنی ناممکن ہے۔ ہر مُلک اور ہر سرزمین کی لوک کہانی پر اُس ملک اور اس سرزمین کا ایک ایسا نقش ہے جو یہاں سے کسی دوسری جگہ نہیں۔ اور اسی لیے کسی مُلک، کسی سرزمین، کسی گروہ اور کسی قوم کی صحیح اور مکمل تصویر اگر کہیں مل سکتی ہے تو لوک کہانی میں۔

لوک کہانی ذہن سے زیادہ دل کی آواز سُناتی ہے۔ اِس لیے اُسے اُن سب کہانیوں پر تفوق و برتری حاصل ہے۔ جن میں ذہنی کاوشوں کا تصنّع اور فنّی مطالبات کی پیچیدگی شامل ہے۔ لوک کہانی ہر طرح کے تصنّع اور ہر طرح کی پیچیدگی سے پاک اور محفوظ ہے۔ اس لیے سیدھی دل میں جگہ بناتی ہے۔ لوک کہانی اُس عہد کی کہانی ہے جب زندگی کی سب سے بڑی قدر انسانیت اور محبّت و مروّت تھی۔ وہ سینہ بہ سینہ

منتقل ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی ہے۔ اور اس لیے اب بھی پہلے کی طرح انسانیت، محبت اور محبت کی قدروں کی ترجمان اور بے لوث اور پُر خلوص مبلغ ہے۔

تہذیب و تمدّن نے ایشیا اور یورپ کے درمیان، امریکہ اور چین کے درمیان اور اطالیہ اور حبش کے درمیان اتنا بُعد پیدا کر دیا ہے کہ وہ شاید ہی کبھی ایک دوسرے کے قریب آ سکیں۔ لیکن جن سادہ انسانوں کی انسانیت کی ترجمانی لوک کہانیاں کرتی ہیں وہ ایشیا، یورپ، امریکہ، چین اطالیہ اور حبش کے لامتناہی فصل کے باوجود ایک دوسرے سے قریب ہیں۔ وہ تہذیب کے شور و غوغا میں بھی ایک دوسرے کے دل کی دھمک سُنتے اور اس کی لَے اپنے دل کی دھڑکنوں سے ملاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوک کہا پڑھ کر آدمی بڑی دُور دُور کے فاصلے بڑی آسانی سے طے کر لیتا ہے۔

لوک کہانیوں کا موجودہ مجموعہ جسے ریاض جاوید نے بڑے خلوص و انہماک اور بڑی محنت سے جمع کیا ہے۔ پڑھنے والوں کے لیے ایک نئی طرح کی دلچسپی کا سامان تو یقیناً مہیّا کرے گا۔ خدا کرے وہ انسان کی وہ خدمت بھی انجام دے سکے جس کی انسان کو بڑی سخت ضرورت ہے۔ خدا کرے انسان، جاپان، بھارت، چین، عرب، یورپ، ایشیا اور امریکہ اور افریقہ کے امتیاز و تفریق کو مٹا کر ایک دوسرے کو انسانیت کے رشتے سے پہچاننا سیکھ سکے۔

وقار عظیم

اورنٹیل کالج۔ لاہور
۱۱ر نومبر ۵۵ء

جاپان

۱- وِسُتو -
۲- اور اسماتارو کی حیاتِ جاوداں -
۳- بِلّی کا اغوا -

جاپان کی لوک کہانیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ اکثر روحانیات اور ابدی زندگی سے متعلق ہوتی ہیں۔ ابدی زندگی سے لگاؤ، بدھ مت کی تعلیم کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے۔ مشرق کے عام اوہام جاپان کے قدیم کلچر کا ایک نمایاں پہلو ہیں۔ جاپانی فطرتاً مابعدالطبعیات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کی تمام لوک کہانیاں اس قومی احساس سے اجاگر ہیں۔

وِسُتو ___ اور اسماتارو کی حیاتِ جاوداں اس رجحان کی بہترین مثال ہے۔

بِلّی کا اغوا ___ رومانس کی ایک بے مثل کہانی ہے جس میں مشرقی عشق کے تمام مدارج انتہائی خوبصورت انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔

جاپان کی لوک کہانیاں، جاپان کے موجودہ ادب پر براہِ راست اثر انداز ہوتی ہیں۔ ایک جاپانی تنقید نگار کے الفاظ میں "ہمارا ادب عالیہ ہماری لوک کہانیوں کا خوشہ چیں ہے۔"

ان کہانیوں سے جاپان کے ادب اور کلچر کی ایک واضح تصویر روشن ہوتی ہے۔

جاپان

وِسّو

کئی سَو سال گزرے کہ جاپان کے علاقے سورو گا کے ایک وسیع و عریض میدان میں ایک لکڑ ہارا رہتا تھا۔ وہ طویل قامت اور شہ زور شخص تھا۔ وِسّو — ہاں یہی اس کا نام تھا۔ وہ اپنے اہل و عیال سمیت ایک جھونپڑے میں بڑے مزے کے دن گزار رہا تھا۔ ایک رات جب وہ سونے لگا تو اس نے زمین کے نیچے بڑی خوفناک گھڑ گھڑاہٹ سُنی، جو طوفان سے بھی زیادہ زور دار اور ہیبت ناک تھی۔ وِسّو نے سوچا کہ زبردست زلزلہ آنے والا ہے۔ اس نے اپنے بچّے کو گود میں اٹھایا اور بیوی کے ساتھ جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ اب اس کے سامنے ایک عجیب و غریب نظارہ تھا۔

جھونپڑی کے سامنے وسیع میدان میں ایک پہاڑ کھڑا تھا۔ اور اس کی

چوٹی سے دھواں اور آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ یہ پہاڑ دو سو میل کے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ عجیب بات تو یہ تھی کہ وہاں کل تک ایک ہموار اور سپاٹ میدان تھا۔ وِسّو اور اس کے بیوی بچے پہاڑ کو دیکھ کر مبہوت کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان پر کسی نے جادو کر دیا تھا۔

صبح کو جب سورج نکلا تو وِسّو نے دیکھا کہ پہاڑ پر سبز کائی اور چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں موجود ہیں۔ اسے یہ منظر اتنا عجیب معلوم ہوا کہ اس نے اس آتش نشاں پہاڑ کا نام فوجی یاما (ابدی کوہ) رکھ دیا۔ آج بھی یہ پہاڑ اسی نام سے مشہور ہے۔

کچھ عرصے بعد ایک بھکشو (بدھ مت کا راہب) پھرتے پھراتے ادھر آنکلا اور اس نے وِسّو سے یوں خطاب کیا۔

"معزز لکڑہارے! میرا خیال ہے کہ آپ عبادت نہیں کرتے۔"

"اگر ایک عدد بیوی اور نصف درجن بچوں کی پرورش کا سوال درپیش ہو تو عبادت کے لیے وقت کہاں سے آئے؟"

وِسّو کا یہ جواب سُن کر بوڑھے بھکشو کو تاؤ آگیا۔ اور اس نے عبادت نہ کرنے کے خوفناک انجام کو بڑی تفصیل سے بیان کرنا شروع کیا اور اسے مطلع کیا۔ کہ مرنے کے بعد اسے لاکھوں سال کچھوے، چوہے یا کسی اور حقیر کیڑے مکوڑے کی زندگی بسر کرنا پڑے گی۔

"عبادت نہ کرنے کا انجام واقعی بڑا ہیبت اور عذاب ناک ہے"۔ وِسّو نے بوڑھے بھکشو سے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ ضرور عبادت کرے گا۔

"کام اور عبادت —— بھولنا نہیں" بھکشو نے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔
بدقسمتی سے جب وِسّو نے عبادت کرنا شروع کی تو باقی سب معاملات سے بے خبر ہو گیا۔ وہ دن رات عبادت میں مصروف رہتا۔ اور پھر ایک دن ایسا آگیا کہ اس کے دھان کے کھیت بالکل سوکھ گئے اور اس کے بیوی بچے فاقے کرنے لگے۔ وِسّو کی بیوی نے کبھی اپنے خاوند کو ایک سخت لفظ بھی نہ کہا تھا۔ مگر وسّو کی یہ حالت دیکھ کر اسے بڑا غصّہ آیا اور غریب بچّوں کے فاقہ زدہ سُوکھے جسموں کی طرف اشارہ کر کے بولی :-

"وِسّو اُٹھ! اپنی کلہاڑی لے اور ہمارے لیے کچھ کر۔ ورنہ تیری عبادت کی یہ مین مین ہمیں مار دے گی"

یہ سُن کر وسّو اپنی بیوی کا چہرہ حیرانگی سے دیکھنے لگا۔ اور کچھ دیر تک تو اسے کوئی جواب ہی نہ سُوجھا۔ مگر جب وہ بولا تو اس کے الفاظ بیچاری اور مظلوم بیوی کے کانوں کو نشتر معلوم ہوئے۔

"اے عورت! پہلے دیوتا اور بعد میں کچھ اور —— تو گنہگار عورت ہے۔ جو ایسی باتیں کر رہی ہے۔ بس اب تم سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا۔"

پھر وسّو نے اپنی کلہاڑی سنبھالی اور جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔ اور چند لمحات کے بعد وہ فوجی یاما پر چڑھنے لگا، جہاں دھند نے اسے جلد ہی نظروں سے اوجھل کر دیا۔

پہاڑ پر ایک جگہ وِسّو بیٹھا ہی تھا کہ اسے جھاڑیوں سے کھڑ کھڑاہٹ معلوم دی اور ایک لومڑی جھاڑی سے نکل کر دوسری طرف بھاگ گئی۔ وِسّو نے

خیال کیا کہ لومڑی دیکھنا خوش قسمتی کی نشانی ہے۔ اور وہ اپنی عبادت کو بھول کر لومڑی کے تعاقب میں بھاگا۔ لیکن اسے لومڑی کہیں نظر نہ آئی۔ جب ہار تھک کر وہ لومڑی کا خیال چھوڑنے لگا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک چھوٹی سی سپاٹ جگہ پر پڑی۔ جہاں انتہائی حسین عورتیں گو[۱] کھیلنے میں مصروف تھیں۔

وِسّو لکڑہارا ان عورتوں کو دیکھ کر کھڑے کا کھڑا رہ گیا اور ایک لفظ زبان سے نکالے بغیر وہ پاس ہی پتھر پر بیٹھ گیا اور بڑے انہماک سے کھیل دیکھنے لگا۔ اس جگہ مکمل خاموشی تھی۔ صرف تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد مہرے بدلنے کی آواز آتی تھی۔ یا دُور پہاڑی چشمے سے پانی گرنے کی مدّھم آواز اس سکوت کو توڑتی تھی۔ ان عورتوں نے وِسّو کی موجودگی پر توجہ ہی نہ دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عورتیں ایک نہ ختم ہونے والے کھیل میں مستغرق تھیں۔

وِسّو ان حسین عورتوں سے اپنی نظریں باوجود کوشش کے ہٹا نہیں سکتا تھا۔ اس کی نظریں کبھی ان کے سیاہ اور طویل بالوں پر پڑتیں۔ کبھی ان کے ننھے ننھے اور پیارے ہاتھوں پر جم جاتیں، جو بار بار ریشمی آستینوں سے مہرے بدلنے کے لیے نکلتے تھے۔ وِسّو اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھا ان عورتوں کا کھیل دیکھتا رہا، حتیٰ کہ تین سو سال گزر گئے۔ مگر اتنا طویل عرصہ وِسّو کو موسم بہار کی ایک دوپہر معلوم ہوتی تھی۔ اچانک اس کی نظر پڑی کہ ایک عورت غلط چال چل

---

[۱] گو شطرنج سے ملتا جلتا ایک جاپانی کھیل ہے۔ مگر شطرنج سے زیادہ مشکل ——
اس کی مہریں اور چالیں بہت زیادہ تعداد میں ہوتی ہیں۔

رہی تھی۔

"غلط اے حسین محترمہ! آپ نے غلط چال چلی ہے"۔ وِسّو بے اختیار چلّا اٹھا۔ اور دوسرے لمحے وہ عورتیں لومڑیاں بن کر جھاڑیوں میں غائب ہو گئیں۔

جب وِسّو نے ان کا تعاقب کرنے کا ارادہ کیا، تو یہ محسوس کر کے اس کے جسم سے پسینہ چھوٹ گیا کہ وہ کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اس نے اپنے جسم پر نظر ڈالی تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ کیونکہ اس کے ہاتھوں پر جھرّیاں پڑ چکی تھیں۔ اور اس کی سفید داڑھی زمین کو چھو رہی تھی۔ اس نے اپنی کلہاڑی زمین سے اٹھانا چاہی۔ تو وہ یہ دیکھ کر اور زیادہ پریشان ہوا کہ کلہاڑی کا چوبی دستہ مٹی ہو چکا تھا۔ حالانکہ یہ دستہ مضبوط ترین لکڑی کا بنا ہوا تھا۔

بڑی تکلیف اور کوشش کے بعد وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکا۔ اور نہایت آہستہ آہستہ پہاڑ سے نیچے اُترنے لگا۔ جب وہ اپنے جھونپڑے کے پاس پہنچا، تو اس کی حیرانگی کی انتہا نہ رہی کیونکہ وہاں جھونپڑی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ قریب ہی ایک ضعیفہ پر وِسّو کی نظر پڑی۔ تو اس نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"بڑی بی! میں یہ دیکھ کر بڑا حیران ہوا ہوں کہ میرا گھر یہاں سے غائب ہے۔ آج ہی تو میں دوپہر کو یہاں سے گیا تھا۔ اور اب شام کو یہاں آیا ہوں۔ میری جھونپڑی کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔"

بڑھیا کو جب یقین ہو گیا کہ یہ پاگل آدمی اسی سے مخاطب ہے تو اس نے اس کا نام پوچھا۔ جب وِسّو نے اپنا نام بتایا۔ تو بُڑھیا نے کہا۔

"تم ضرور سر پھرے ہو۔ وستو تو تین سو سال پہلے یہاں رہا کرتا تھا۔ ایک روز وہ پہاڑ پر گیا اور اس کے بعد وہ واپس نہیں آیا۔"

"تین سو سال ——" وستو بڑبڑایا۔ "یہ کیسے ممکن ہے۔ میری پیاری بیوی اور بچے کہاں ہیں ؟"

"قبرستان میں" بڑھیا نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "جو تم کہہ رہے ہو، اگر وہ سچ بھی ہو، تو تمھارے بچوں کے بچے بھی مٹی میں مل گئے ہوں گے۔ بیوی بچوں کو یوں بغیر آسرے کے چھوڑنے کی سزا تمھیں دیوتاؤں سے ملی ہے کہ تمھاری عمر اتنی طویل ہو گئی ہے۔ اور اب تم خود بے یار و مددگار اور بے آسرا ہو۔"

یہ سن کر وستو کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ اور وہ واپس پہاڑ کی سمت چل دیا۔ جاتے جاتے وہ بڑھیا کو یہ کہہ گیا۔

"محترمہ! مجھ بدنصیب وستو کے الفاظ یاد رکھو۔ عبادت اور کام —— کام اور عبادت۔"

اس کے بعد وستو کو کسی نے نہیں دیکھا۔ البتہ آج بھی کئی لوگ کہتے ہیں کہ چاندنی راتوں میں وستو کی روح فوجی یاما پر سرگرداں پھرتی ہے۔ اور اپنی نجات کے لیے دعا مانگتی ہے۔

اوراشما تارو کی حیاتِ جاوداں

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ سمندر کے کنارے ضعیف ماہی گیر میاں بیوی رہتے تھے۔ ان کا اکلوتا بیٹا ان کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور تھا۔ اسے دیکھ کر وہ جیتے تھے۔ اس کی خاطر وہ اپنے بڑھاپے میں بھی سخت سے سخت محنت کرنے کے لیے تیار تھے۔ غرض کہ وہ اپنی قسمت پر نازاں تھے۔

ان کے بیٹے کا نام اوراشما تارو تھا۔ جاپانی زبان میں اس کا مطلب "جزیرہ کا بیٹا" ہے۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو وہ جیالا نوجوان نکلا۔ وہ ہوشیار مانجھی اور مشّاق پیراک تھا۔ وہ اپنی کشتی کو سمندر میں اتنی دُور لے جاتا تھا کہ گاؤں کا بہادر سے بہادر نوجوان بھی اتنی دُور جانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ کئی بار اوراشما تارو کی دلیری اور بے خوفی کو دیکھ کر گاؤں کے بڑے

بوڑھے معنی خیز انداز میں سر ہلاتے تھے۔ اور اس کے والدین سے کہا تھا "اگر تمھارا بیٹا ایسا ہی جری رہا تو کسی نہ کسی دن سمندر کی لہریں اسے ہمیشہ کے لیے اپنی آغوش میں لے لیں گی۔" مگر اوراشماتارو ایسی باتوں پر دھیان نہ دیتا تھا۔ کیونکہ اسے اپنی چھوٹی سی مضبوط کشتی پر پورا اختیار تھا۔ اور اس کے والدین کو اپنے بیٹے کی بہادری پر یقین تھا۔ اس لیے وہ زیادہ پریشان نہ تھے۔

ایک سہانی صبح کو جب وہ اپنا بھرپور جال پانی سے کھینچ رہا تھا تو اس نے مچھلیوں میں ایک ننھّا کچھوا دیکھا۔ اس نے جال اپنی کشتی میں پھینکا اور اس کچھوے کو لکڑی کے ایک ڈبے میں رکھ دیا۔ تاکہ گھر جاتے ہوئے اسے بھی مچھلیوں کے ساتھ لے جائے۔ دیوتاؤں کی مہربانی سے کچھوے کو زبان مل گئی۔ اور وہ اپنی پتلی اور کانپتی ہوئی آواز میں اپنی جان بخشی کی التجا کرنے لگا۔ "میں آپ کے کسی کام آسکتا ہوں۔ میں اتنا چھوٹا اور اتنا حقیر سا ہوں کہ سمندر کے بغیر جلد ہی مرجاؤں گا۔ میں زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتا ہوں مجھ پر رحم کیجیے اور مجھے آزاد کر دیجیے۔ مجھے معلوم ہے کہ احسان کا بدلہ کس طرح چکایا جاتا ہے۔ اس لیے مجھے آزاد کر دیجیے —— مجھے آزاد کر دیجیے۔"

اوراشماتارو بڑی پیاری طبیعت کا لڑکا تھا۔ نہ کرنا تو جانتا ہی نہ تھا۔ اس لیے اس نے کچھوے کو فوراً سمندر میں ڈال دیا۔ اس واقعے کو کئی سال گزر گئے۔ اوراشماتارو سمندر میں دُور دُور مچھلیاں پکڑنے جاتا رہا۔ ایک روز جب وہ سمندر میں دُور چٹانوں کے درمیان اپنی کشتی گزارنے ہی لگا تھا کہ

ایک دم زور کا جھکڑ چلا اور کشتی چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگئی۔ اوراشماتارو کا انجام بھی یہی ہوتا۔ چونکہ وہ زبردست پیراک تھا اس لیے وہ پتھروں سے ٹکرانے سے محفوظ رہنے میں کامیاب رہا اور ساحل پر پہنچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ ابھی اس نے دو چار ہاتھ ہی مارے تھے کہ اسے اپنی طرف بہت بڑا کچھوا آتا نظر آیا۔ طوفان کے شور میں اسے کچھوے کی آواز سنائی دی۔

"جناب عالی! میں وہی کچھوا ہوں۔ آپ نے کمال مہربانی سے جس کی جان بخشی تھی۔ اب میں مہربانی کا بدلہ چکانے آیا ہوں۔ ساحل ابھی بہت دُور ہے۔ آپ میری مدد کے بغیر وہاں تک پہنچ نہیں سکتے۔ میری پشت پر تشریف رکھیے اور آپ جہاں چاہیں، وہاں آپ کو اتار دوں گا۔"

اوراشماتارو نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے دوست کی مدد قبول کرلی۔ جب وہ کچھوے کی پشت پر جم کر بیٹھ گیا، تو کچھوے نے تجویز پیش کی کہ ساحل پر جانے سے پہلے سمندر کے نیچے چلنا چاہیے اور وہاں عقل کو دنگ کر دینے والے بحری عجائبات دیکھنے چاہییں۔ اوراشماتارو کو یہ تجویز بڑی پسند آئی۔

کچھوا اسے سمندر کے نیچے لے جانے لگا۔ اب ان کے اوپر اور نیچے، دائیں اور بائیں گہرا نیلا پانی تھا۔ وہ تیر کی سی تیزی سے نیم گرم پانی میں بھاگنے لگا۔ نوجوان نے کچھوے کی پشت کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور خوب جم کر بیٹھ گیا۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ کچھوا اسے کہاں لے جائے گا۔ اور یہ سفر کتنی دیر جاری رہے گا۔

تین دن تک وہ اسی طرح سفر کرتے رہے۔ آخر کچھوا ایک عالی شان محل کے سامنے جا ٹھہرا۔ یہ محل سونے چاندی اور ہیروں سے بنا ہوا تھا۔ محل کے باہر درختوں کی جگہ موتیوں کی جھاڑیاں چمک رہی تھیں۔ چاروں طرف ہلکی سبز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس سے آنکھوں کو بڑی ٹھنڈک پہنچتی تھی۔ اوراشماتارد بیرون محل کی خوبصورتی کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ محل کے دیوان خانے کی دیواریں مچھلیوں کے عجیب وغریب اور رنگ برنگے 'چانوں' سے بنی ہوئی تھی۔ ان سے ہلکی روشنی نکل رہی تھی۔ دیوان خانے میں گہرے سبز رنگ میں یہ روشنی عجیب بہار دکھا رہی تھی۔

"بھئی مجھے کہاں لے آئے ہو؟" اوراشماتارو نے پوچھا۔

"رنگوں کے محل میں"۔ کچھوے نے جواب دیا۔ "یہ محل سمندر کے دیوتا کا ہے۔ ہم سب اس کی رعایا ہیں۔ میں رنگوں کی بیٹی، سب سے زیادہ حسین شہزادی اتوہیمی کا خاص خدمت گار ہوں۔ ابھی شہزادی سے آپ کی ملاقات کراتا ہوں"۔

اوراشماتارو، اس سفر ہی سے اتنا حیران ہو چکا تھا کہ اس نے مزید کچھ نہ پوچھا اور آنے والی گھڑیوں کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔

کچھوا شہزادی اتوہیمی سے اوراشماتارو کی بہت تعریف کر چکا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ کچھوے کو جب بھی موقع ملتا، وہ اوراشماتارو کا قصہ لے بیٹھتا تھا۔ اس طرح شہزادی کو اوراشماتارو کو دیکھنے کا بڑا اشتیاق ہو چکا تھا۔

جب اوراشماتارو دیوان خانے سے اتر کر شہزادی کے خاص کمرے میں گیا تو دیکھتا کیا ہے کہ ایک بہت بڑے سیپ میں شہزادی بیٹھی ہے۔ سیپ کا کھلا

ڈھکنا تخت کا چھتر معلوم ہوتا تھا اور اس میں جڑے ہوئے مختلف ہیروں اور جواہرات سے دھنک کے ساتوں رنگ نکل رہے تھے۔ سیپ کے ارد گرد ننھی ننھی مچھلیاں منڈلا رہی تھیں۔ ایسی مچھلیاں اوراشماتارو نے کبھی دیکھی نہ سنی تھیں۔ ان مچھلیوں سے اتنی پیاری پیاری موسیقی نکل رہی تھی کہ بس سونے کو جی چاہتا تھا۔ شہزادی اتوہیمی، اوراشماتارو کو دیکھ کر اٹھی اور پہلی ہی نظر میں گھائل ہو گئی۔ اور شرماتے ہوئے التجا کرنے لگی کہ اوراشماتارو اس کے پاس ہی رہے اور اس نے وعدہ کیا کہ اگر وہ شہزادی کے پاس ہی رہے گا تو اسے حیاتِ جاوداں مل جائے گی اور اس کی خوبصورتی ابد تک قائم رہے گی۔

"کیا یہ انعام آپ کے لیے کافی نہیں؟ اے دھرتی کے بیٹے!" یہ کہہ کر شہزادی مسکرائی۔ سبز رنگ کے ماحول میں شہزادی کی مسکراہٹ سورج کی پہلی کرن کی مانند تھی۔ اور —— اوراشماتارو کے من کی کامنا جاگ اٹھی۔ اس نے جواب دیا۔

"دیوی! میں آپ کے قدموں میں رہوں گا۔"

اوراشماتارو کی زندگی خوشی، مسرّت، اطمینان اور سکون کے نرم و نازک پر دل پر بسر ہونے لگی۔ انسان تو اتنی مکمل اور گہری خوشی کا تصور ہی نہیں کرسکتا۔ آنے والی ہر گھڑی گزری ہوئی گھڑی سے کچھ زیادہ ہی خوشی لاتی۔ وہ شہزادی کا محبوب کیا بنا گویا کہ اسے گم شدہ جنّت مل گئی۔

ایک روز غیر متوقع اور اچانک اس کے جی میں اپنے ضعیف والدین کو ایک نظر دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے اس خواہش کو دبانے کی بڑی

کوشش کی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر شہزادی کو اس کی اس خواہش کا علم ہو گا تو بڑی دکھی ہو گی۔ پھر بھی وہ اپنی اس خواہش پر جو اب تمنا بن چکی تھی، قابو نہ پا سکا۔ اس کی اس بے چینی نے اسے مغموم کر دیا۔ شہزادی نے جب اس کے غم اور پژمردگی کا سبب دریافت کیا، تو وہ ٹالتا رہا۔ آخر کار اسے بتانا پڑا کہ اسے دھرتی پر اپنا پرانا مکان یاد آتا ہے اور وہ اپنے والدین کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہے۔ صرف ایک بار وہ اپنی پیاری ماں اور محترم باپ کو دیکھنے کی آرزو اُسے اندر ہی اندر جلائے جا رہی ہے۔

شہزادی نے جب یہ سُنا تو اس کا رنگ فق ہو گیا۔ اور اشما تارو سے بڑے دُکھی لہجے میں منت کرنے لگی کہ وہ یہ خواہش دل سے نکال دے۔ ورنہ مصیبت اور دُکھ کا ایک ایسا پہاڑ لوٹ پڑے گا کہ جس سے فنا یقینی ہے۔ اوراشما تارو نے دل گیر آواز میں کہا۔

"میری شہزادی، میں اپنے دل سے مجبور ہوں۔ والدین کو دیکھنے کا خیال جتنا دور کرنے کی کوشش کرتا ہوں، اتنی ہی شدّت سے یہ مجھے بے چین کرتا ہے۔"
شہزادی کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اور یہ آنسو سچّے موتی بن کر تیرنے لگے۔ شہزادی نے بڑی مشکل سے کہا۔

"اوراشما تارو! تم پھر کبھی واپس نہیں آسکو گے۔ ہم پھر کبھی نہیں مل سکیں گے۔ مجھے جانے دو۔ ایک بار صرف ایک بار میں دھرتی کو دیکھ آؤں۔ پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میں تمھارے پاس آجاؤں گا۔"
شہزادی نے بڑے افسوس اور بڑے ہی دُکھ سے اپنا سر ہلایا اور تھوڑی

دیر خاموش رہنے کے بعد بولی ۔

" صرف ایک طریقہ ایسا ہے کہ تم واپس آ سکو۔ مگر مجھے امید نہیں کہ تم اس شرط پر پورے اُتر سکو "۔

" میری شہزادی یقین مانو! میں تمھارے پاس آنے کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں "۔ اوراشماتارو پیاری پیاری نظروں سے شہزادی کو دیکھنے لگا ۔ اور شہزادی بھی چُپ چُپ افسردہ ہو کر اسے دیکھتی رہی ۔ کیونکہ وہ جانتی تھی ۔ کہ اوراشماتارو جب یہاں سے چلا جائے گا تو وہ پھر اس کی صورت دیکھ نہیں سکے گی۔

شہزادی اٹھی اور طاق سے سونے کی ایک ننھی ڈبیہ اٹھائی اور اسے دیتے ہوئے ملتجانہ لہجے میں کہنے لگی ۔

" اس ڈبیہ کی بڑی حفاظت کرنا ۔ خاص طور پر اسے کسی بھی حالت میں نہ کھولنا ۔ اگر تم ڈبیہ کو اس طرح اپنے پاس رکھ سکو گے تو پھر تمھارا دوست کچھوا تمھیں واپس لانے کے لیے ساحل پر پہنچ جائے گا ۔ وہ تمھیں پہلے کی طرح یہاں لے آئے گا "۔

اوراشماتارو نے شہزادی کا شکریہ ادا کیا اور حلف اٹھایا کہ وہ اس کی ہدایت پر ہر حالت میں عمل کرے گا ۔ ڈبیہ اس نے اپنے لباس میں چھپالی اور کچھوے کی پشت پر بیٹھ گیا ۔

الوداعی ہاتھ ہلاتا ہوا سمندر کے گہرے نیلے پانی میں گُم ہو گیا ۔ جب تک شہزادی کو اوراشماتارو نظر آتا رہا وہ کھڑی اسے دیکھتی رہی ۔ تین دن اور تین راتیں وہ کچھوے کی پشت پر سفر کرتا رہا ۔ آخر کچھوے نے ساحل پر اس کے گاؤں

کے نزدیک اسے اُتار دیا۔ کچھوا اسے سلام کرکے فوراً سمندر میں غائب ہوگیا۔
وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوُا اپنے گاؤں کی طرف بڑھا۔ ماہیوں کے جھونپڑوں
سے دھواں نکل رہا تھا، جھونپڑوں کے سامنے چھوٹے چھوٹے باغیچوں میں ننھے
بچے کھیل رہے تھے اور ایک دوسرے کو پکار رہے تھے۔ ایک کھڑکی سے اسے
کوتو (جاپانی ستار) بجنے کی آواز سنائی دی۔ پُرسکون گاؤں کے اس منظر کو
دیکھ کر اسے ایسا محسوس ہوُا کہ ہر چیز اس کا خیر مقدم کر رہی ہے۔ خوش آمدید
کہہ رہی ہے۔ جب وہ گاؤں کی درمیانی گلی سے گزر رہا تھا تو اسے یک لخت
ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے اس کے دل کو مٹھی میں دبوچ لیا ہے۔ کیونکہ اب
اسے معلوم ہوا کہ گاؤں کی ہر چیز بدلی ہوئی ہے۔ ان جھونپڑوں اور لوگوں
کو وہ پہچانتا نہ تھا۔ کافی دیر تک وہ حیران و پریشان اپنے گرد و پیش دیکھتا رہا۔
پھر وہ اپنی پُرانی جھونپڑی کے نزدیک گیا۔ جھونپڑی تو وہی تھی مگر —— مگر
کچھ عجیب معلوم ہوتی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر دستک دی۔ تو دروازے
پر ایک نوجوان عورت نظر آئی۔ اور اشما تارو نے اپنے والدین کے متعلق دریافت
کیا تو اس نے جواب دیا کہ وہ اس نام کے کسی مرد یا عورت کو نہیں جانتی۔
یہ سُن کر اُراشما تارو کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ بے تحاشا قبرستان
کی طرف بھاگا۔ کیونکہ اب صرف یہی ایسی جگہ ہو سکتی تھی جہاں اسے اپنے سوالات
کا جواب مل سکتا تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ اپنے والدین کی قبروں کے
سامنے کھڑا تھا۔ قبروں کے کتبے پر وہی تاریخ کندہ تھی۔ جس تاریخ کو ان
کا اکلوتا بیٹا سمندر میں غائب ہوا تھا۔ یا ان کے بیٹے نے سمندر کی بیٹی کے

لیے انھیں چھوڑ دیا تھا۔ اور جب اسے معلوم ہوا کہ اسے والدین سے جُدا ہوئے تین سو —— پورے تین سو سال ہوئے ہیں، تو وہ دہشت سے کانپنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اَن جانے ڈر کا سانپ اس کے دل کو چاٹ رہا ہے۔ وہ اُلٹے پاؤں گاؤں کی طرف بھاگا۔ اب اس کی یہی آرزو تھی کہ اسے کوئی ایسا آدمی مل جائے جو بیتے زمانے کے متعلق اسے کچھ بتا سکے۔ گاؤں کے بڑے بوڑھوں سے اپنے والدین کے متعلق پوچھا۔ مگر وہ اس کا منہ دیکھتے رہ جاتے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہا۔ مگر ساتھ ہی اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کے حواس ٹھکانے نہیں رہے۔

اس ناامیدی اور مایوسی کی حالت میں اوراشماتارو کو شہزادی کی ڈبیہ کا خیال آیا۔ شاید جو کچھ مَیں دیکھ رہا ہوں حقیقت نہ ہو۔ شاید میں کسی جادو کے زیرِ اثر ہوں اور یہ ڈبیہ اس جادو کا توڑ ہو۔ اور بے خیالی میں اس نے ڈبیہ کو کھول لیا۔ اس میں سے گہرے رنگ کی مٹیالی بھاپ سی نکلی۔ وہ اس طرح بے خیالی میں خالی ڈبیہ کو ہاتھ میں لیے کھڑا رہا۔ اور پھر —— پھر اس کے ہاتھ اور بازو انتہائی ضعیف آدمی کی مانند مرجھا گئے۔ اور اشماتارو کے منہ سے دہشت ناک چیخ نکل گئی۔ وہ بھاگتا ہوا چشمے کی طرف گیا۔ پہاڑی چشمہ تھوڑے ہی فاصلے پر بہتا تھا۔ اس نے جھک کر چشمے میں اپنا عکس دیکھا۔ اور اسے پانی کی سطح پر مٹی کیا ہوا انتہائی مکروہ اور خوفناک چہرہ نظر آیا۔ وہ بے پناہ غم اور دہشت سے نڈھال ہو گیا۔ اس نے مُرجھائے ہوئے ہاتھوں سے اپنا خوفناک چہرہ چھپا لیا۔

پھر وہ رینگتا ہوا گاؤں میں واپس آیا اور ہر شخص اس ضعیف، بہت ہی ضعیف کو دیکھ کر ڈر جاتا۔ کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ یہ وہی خوبصورت نوجوان ہے، جو ایک گھنٹے پہلے گاؤں سے بے تحاشا بھاگا جا رہا تھا۔

آخر وہ بڑی مایوسی اور بددلی سے رینگتا رینگتا سمندر کے ساحل پر پہنچا۔ ایک ٹیلے پر بیٹھ کر اس نے بڑی رقت انگیز آواز میں اپنے دوست کچھوے کو پکارنا شروع کیا۔ لیکن کچھوا پھر نظر نہیں آیا۔ یہ حالت دیکھ کر موت کی دیوی کو اس پر رحم آگیا۔ اور اس نے اسے اپنے سیاہ پروں میں چھپا لیا۔ اس طرح اوراشما تارو کو اس دُکھ درد سے نجات مل گئی۔

مرنے سے پہلے چند لوگوں نے اوراشما تارو کو ٹیلے پر اکیلا اور اُداس بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ انھوں نے اس کی دُکھ بھری کہانی سُنی تھی۔ جب ان کے بچّے بے چین ہوتے یا ان کا حکم نہ مانتے تو وہ انھیں اوراشما تارو، ایک اچھے بیٹے کی کہانی سناتے، جس نے اپنے والدین کی محبّت میں سمندری محل کی شان و شوکت اور دنیا کی سب سے زیادہ حسین شہزادی کو چھوڑ دیا تھا۔

بلّی کا اغوا

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک بہت ہی حسین اور پیارا بِلاّ تھا۔ اس کی کھال اتنی نرم اور چمکیلی تھی کہ جیسے ستیل ہو۔ اور اس کی خوبصورت اور دانش مند سبز آنکھیں تاریکی میں بھی دیکھ سکتی تھیں۔ اس کا نام گون تھا۔ اس کا مالک موسیقی کا ایک استاد تھا، جو گون کو بے حد پیار اور اس پر اتنا فخر کرتا تھا کہ وہ دُنیا کی کسی چیز کے بدلے گون سے جدا ہونا برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

موسیقی کے اُستاد کے مکان سے تھوڑے فاصلے پر ایک خاتون رہتی تھی۔ اس کے پاس ایک ننھی اور حسین بلّی تھی، جس کا نام کوما تھا۔ کوما بڑی ہی پیاری بلّی تھی۔ وہ اپنی پیاری آنکھیں ایک خاص انداز سے جھپکتی اور کھانا بڑے سلیقے سے کھانے کے بعد جب وہ اپنی گلابی ناک کو اپنی ننھی زبان سے اس نزاکت

کے ساتھ صاف کرتی تھی کہ اس کی مالکہ اسے دیکھ کر بار بار یہ کہتی ۔ "کوما ـــــ کوما ـــــ میں تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی ۔"

خیر ـــــ ایک شام چہل قدمی کے لیے دونوں نکلے اور اتفاق سے شاہ دانے کے درخت کے نیچے کوما اور گون کی ملاقات ہوگئی ۔ پہلی ہی نظر میں دونوں ایک دوسرے کے فریفتہ ہوگئے ۔ گون جانتا تھا کہ اب وقت آگیا ہے کہ اسے اپنے لیے رفیقۂ حیات کا انتخاب کرنا پڑے گا ۔ کیونکہ کچھ عرصے سے اڑوس پڑوس کی سب نوجوان بلّیاں اس کی طرف خاص توجہ دے رہی تھیں ۔ اس وجہ سے گون کو الجھن سی ہو رہی تھی ۔ چونکہ اس کا معیارِ حسن اور انتخاب عامیانہ نہ تھا ۔ لہٰذا وہ کسی بلّی کی پروانہ کرتا تھا ۔ اب اس سے پیشتر کہ وہ کچھ سوچ سکتا وہ عشق کے دیوتا کے دام میں گرفتار ہوچکا تھا ۔ اس کا دل کوما کی محبّت سے لبریز ہوگیا ۔

کوما نے بھی محبّت کا جواب محبت سے دیا ۔ لیکن صنفِ نازک کی مانند اسے کتنی دشواریاں نظر آرہی تھیں ۔ اس نے بڑی دردمندی کے ساتھ گون سے مشورہ کیا کہ ان رکاوٹوں کو کیسے دُور کیا جائے ۔ گون نے اپنے مالک سے درخواست کی کہ وہ اس معاملے کو سلجھانے کے لیے کوما کو خرید لے ۔ لیکن کوما کی مالکہ اس سے جدا ہونا نہیں چاہتی تھی ـــــ اس کے بعد موسیقی کے استاد سے کہا گیا کہ وہ گون کو خاتون کے ہاتھ فروخت کردے ۔ لیکن وہ اس قسم کا مشورہ بھی سننے کے لیے تیار نہ ہُوا ۔ اور اس طرح یہ معاملہ جوں کا توں رہا ۔

آخر کار کوما اور گون کی محبّت اس انتہا کو پہنچ گئی کہ انھوں نے فیصلہ کرلیا کہ کچھ بھی کیوں نہ ہو، وہ اپنی محبّت کی تکمیل خود ہی کریں گے ۔ اور آئندہ تمام زندگی

اکٹھے گزاریں گے۔ ایک چاندنی رات کو وہ چپکے سے اپنے اپنے گھروں سے نکلے اور اس نامعلوم اور اجنبی دنیا میں داخل ہو گئے۔ دن بھر دونوں بڑی دلیری سے دھوپ میں چلتے رہے۔ حتیٰ کہ ان کے گھر بہت دُور رہ گئے۔ شام کو وہ ایک باغ میں جا نکلے۔ اب وہ بہت ہی تھک چکے تھے۔ انھیں نرم اور ٹھنڈی گھاس ستانے کی دعوت دینے لگی۔ درختوں کے طویل سائے ٹھنڈک پہنچا رہے تھے۔ اچانک ایک قدآور اور خوفناک کتّا وہاں آنکلا۔ وہ اپنے خونخوار دانت نکال کر ان پر جھپٹا۔ کوما خوف سے چیختی ہوئی درخت پر چڑھ گئی۔ لیکن گون وہیں جی داری سے ڈٹا رہا۔ اور کتّے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اسے اس وقت ایک ہی خیال تھا کہ کوما کی نگاہیں اس پر جمی ہیں۔ اس لیے بھاگنے کے متعلق سوچنا بھی نہ چاہیے۔ لیکن افسوس! اگر کہیں وہ خونخوار کتا اس پر حملہ کر دیتا تو گون کا حوصلہ اور دلیری کسی کام نہ آتی۔ کوما درخت پر بیٹھی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ وہ اس اُمید پر زور زور سے چلّانے لگی کہ شاید کوئی راہ گیر مدد کو پہنچ جائے۔ خوش قسمتی سے اس شہزادی کے ایک خدمت گار کا وہاں سے گزر ہوا جس کا یہ باغ تھا۔ اس نے وہاں سے کتّے کو دھتکارا اور کانپتے ہوئے گون کو گود میں اٹھا کر شہزادی کے پاس چل دیا۔

بے چاری کوما اکیلی اور بے یار و مددگار رہ گئی۔ اور گون ایک علیحدہ مصیبت میں گرفتار ہو گیا۔ گون کو سمجھ نہ آتی تھی کہ اب وہ کیا کرے۔ شہزادی کا پیار بھی اسے خوش نہ کر سکا جو اس کی خوبصورتی اور دل لبھانے والی عادتوں کو دیکھ کر نہال ہوئی جاتی تھی۔ تقدیر کا مقابلہ کرنے سے کیا فائدہ۔ وہ راضی برضا ہو کر

مستقبل کا انتظار کرنے لگا۔

گون کی یہ نئی مالکہ شہزادی اتنی حسین اور خوش اخلاق تھی کہ ہر شخص اس سے محبت کرتا تھا۔ اس کی زندگی خوشی سے بھرپور ہوتی اگر ایک سانپ اس کے عشق میں گرفتار نہ ہو گیا ہوتا۔ یہ سانپ اپنی موجودگی سے شہزادی کو اکثر پریشان کرتا تھا۔ شہزادی نے اپنے خدمت گاروں کو حکم دے رکھا تھا کہ جب بھی وہ سانپ کو دیکھیں تو اسے فوراً بھگا دیں۔ لیکن خدمت گار کچھ بے پرواسے تھے۔ اور سانپ بڑا چالاک۔

بعض اوقات وہ خدمت گاروں سے آنکھ بچا کر شہزادی کو خوف زدہ کرنے کے لیے اس کے سامنے آجاتا تھا۔ ایک دن وہ اپنے کمرے میں بیٹھی اپنا دل پسند ساز بجا رہی تھی۔ تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے لبادے پر کوئی چیز رینگ رہی ہے۔ جب اس نے لبادے کی طرف دیکھا تو اس کا ازلی دشمن سانپ اس کے رخسار کو چومنے کے لیے بڑھ رہا تھا۔ شہزادی کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی اور وہ پیچھے کو گر پڑی۔

گون جو اس کے پاؤں کی طرف ایک چوکی پر بیٹھا تھا، اس نے شہزادی کے خوف کو سمجھ لیا اور ایک ہی چھلانگ لگا کر اس نے سانپ کو گردن سے پکڑ لیا۔ سانپ کی گردن میں اپنے تیز دانت پیوست کر دیے۔ اور ایک زور کا جھٹکا دے کر اسے دُور پھینک دیا۔

اب سانپ شہزادی کو پریشان نہیں کر سکتا تھا۔ شہزادی نے گون کو اٹھایا اور اس کی تعریف کرنے لگی۔ اور اس روز سے گون کا اور بھی زیادہ خیال رکھنے

لگی۔ لیکن گون اُداس رہتا۔ اسے کوما کو ایک نظر دیکھنے کی تمنا ہر وقت مغموم بنائے رکھتی۔

وقت گزر گیا اور بچھڑے ہوئے ساتھی ایک دوسرے کی یاد میں تڑپتے رہے۔ ایک صبح گون دروازے کے باہر دھوپ میں لیٹا تھا اور اپنے سامنے پھیلی ہوئی دنیا کو بڑی بے زاری سے دیکھ رہا تھا کہ اچانک دُور سے اسے ایک موٹی تازی بلی نظر آئی، جو ایک ننھی بلی کو تنگ کر رہی تھی۔ گون کو بڑا غصّہ آیا، اور وہ غراتا ہوا بھاگا۔ اور آنکھ جھپکتے ہی اس نے موٹی بلی کو بھگا دیا۔ جب وہ ننھی بلی کی طرف مُڑا تو اس کا دل خوشی سے تقریباً پھٹ گیا۔ کیونکہ اس کے سامنے دُکھوں کی ماری کوما تھی۔ کوما پہلی نظر میں تو اسے پہچان نہ سکی۔ کیونکہ اب گون موٹا اور رعب دار ہو چکا تھا۔ اور جب اسے یقین ہو گیا کہ یہ گون ہی ہے تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ دونوں اپنے سر اور ناک ایک دوسرے سے بار بار رگڑنے لگے۔ ان کی کھُر کھُر کی آواز ایک میل تک سُنی جا سکتی تھی۔

پنجے میں پنجہ دیے دونوں شہزادی کے سامنے گئے۔ اور اپنی زندگی کی درد ناک کہانی سنائی۔ شہزادی کے بھی آنسو نکل آئے۔ اور اس نے وعدہ کیا کہ اب وہ کبھی جدا نہیں کیے جائیں گے۔ بلکہ زندگی کے آخری دنوں تک شہزادی کے ساتھ رہیں گے۔

کچھ عرصے بعد شہزادی کی شادی ہو گئی۔ اور یہ دونوں اسی کے محل میں رہنے لگے۔ شہزادی نے اپنے دولہا کو گون اور کوما کے متعلق بتایا کہ کس طرح

گون نے دشمن سانپ سے شہزادی کو رہائی دلوائی تھی۔ گون کتنا بہادر ہے۔
شہزادے نے یہ سن کر قسم کھائی کہ وہ انھیں کبھی جدا نہیں کرے گا پھر
جہاں کہیں بھی شہزادی جاتی تو گون اور کوما اس کے ساتھ ضرور ہوتے۔
کوما اور گون کے بہت بچے ہوئے اور اسی طرح شہزادی کے بھی بچے ہوئے۔
یہ بچے اکٹھے کھیلتے اور ساری عمر پکے دوست رہے۔

بھارت

۱۔ بندر اور ریچھ
۲۔ بلّی اور گدھ

تقریباً ہزار سال پہلے قدیم بھارت میں، پدپائی یا پل پائی۔ داستان گو یا کہاوتیں کہنے والا گزرا ہے۔ اس کی لوک کہانیوں کو ایک مسلسل داستان کی صورت میں مرتّب کیا گیا۔ اصل مسودہ تو ناپید ہے۔ البتہ ۷۵۰ء میں کسی عرب عالم نے ان کہانیوں کا سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کیا۔ اس ترجمے سے مختلف زبانوں میں ان کہانیوں کو منتقل کیا گیا۔

ان کہانیوں کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ پدپائی کے مخصوص فلسفے کو پیش کرتی ہیں۔ یہ کہانیاں مختصر نہیں بلکہ طویل اور گنجلک ہیں۔ اور اس طویل قصّے سے چھوٹی چھوٹی کہانیاں نکلی ہیں۔

بندر اور ریچھ، بلّی اور گدھ قصّہ در قصّہ مکمل کہانیاں ہیں۔ اور قدیم عیارت کی بہترین لوک کہانیوں میں شمار ہوتی ہیں۔

بندر اور ریچھ

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جنگل کے ایک شاداب کنج میں بندروں کی اچھی خاصی تعداد رہتی تھی۔ اس کنج میں پھلوں کی افراط تھی اور پانی بھی بہتات سے تھا۔ اس لیے بندروں کی زندگی بڑے مزے سے گزر رہی تھی۔ اتفاق سے ایک روز ایک ریچھ پھرتا پھراتا ادھر آنکلا اور بندروں کو حسد سے دیکھ کر کہنے لگا۔ "میں تو جنگلوں میں پہاڑوں پر اپنی خوراک کے لیے سرگرداں رہتا ہوں۔ اور یہ حقیر جانور بڑے مزے کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ حسد اور غصّے سے وہ پاگل ہو گیا اور یک لخت بندروں پر پل پڑا۔ چند بندروں کو ہلاک کرنے میں کامیاب رہا۔ اتنے میں اور بندر وہاں آگئے اور انھوں نے مل کر اس کا مقابلہ کیا۔ اور ریچھ بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر وہاں سے بھاگا اور پھر اپنے

دوستوں کے پاس چیختا دھاڑتا پہنچا۔ اور انھیں سب ماجرا کہہ سنایا۔ لیکن دوسرے ریچھ اس سے ہمدردی کرنے کی بجائے اس کا مذاق اُڑانے لگے۔ واقعی تم بڑے بزدل نکلے جو اتنے چھوٹے سے جانور سے پٹ گئے۔

آخر ریچھوں کا سردار بولا۔ " بہرحال ہمیں بندروں سے اپنے ساتھی کا انتقام لینا پڑے گا۔"

رات کو سب ریچھ اپنے پہاڑ سے اُترے اور سوئے ہوئے بندروں پر اچانک حملہ کردیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد کئی مردہ بندر جھاڑیوں میں ڈھیر تھے۔ باقی بندر جان بچاکر بھاگ گئے۔

"بندروں کا یہ ملک مجھے پسند ہے۔ اب ہم یہاں ہی رہیں گے"۔ ریچھوں کے سردار نے کہا۔ اور پھر سب ریچھوں نے خوب جی بھر کر قسم قسم کے میوے کھائے اور ٹھنڈا پانی پیا۔

اس دوران میں بندروں کا راجا جو کئی دنوں سے شکار پر گیا تھا، واپس آیا۔ اور جب اس نے اپنے علاقے اور اپنی پرجا کا یہ حال دیکھا تو غم سے نڈھال ہوکر آنسو بہانے لگا۔ اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ کیا کرے۔ ایک بندر میموں جو علم و دانش کی وجہ سے راجا کا معتمد خاص تھا۔ اپنے آقا کو یوں دکھی دیکھ کر سب بندروں سے مخاطب ہوا۔

بھائیو! اب پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میری تجویز کو غور سے سنو! میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ کہ آپ کے لیے اپنی جان تک قربان کردوں۔ میرے بیوی بچے تو فریبی دشمن نے ہلاک کرہی دیے ہیں۔ اور اب مجھے زندہ رہنے

میں دانش مندی نظر نہیں آتی۔ مہاراج! آپ حکم دیں کہ میرے کان کاٹ دیے جائیں۔ اور اس حالت میں مجھے اٹھا کر جنگل کے کنارے تنہا چھوڑ دیا جائے۔ اس کے بعد آپ سب دو روز کی مسافت پر چلے جائیں۔ اور تیسرے روز اپنے گنج میں پہنچ جائیں۔ وہاں امن و امان ملاحظہ فرما دیں ــــ میری آخری خواہش ہے کہ میری موت آپ کے لیے باعثِ رحمت ہو۔"

راجا میموں کی اس درخواست کو سُن کر اور افسردہ ہوا۔ لیکن میموں کے بیحد اصرار پر اس نے اجازت دے دی۔ اس کی خواہش کے مطابق میموں کو سخت زخمی کر کے رات کو جنگل کے کنارے چھوڑ دیا گیا۔ وہاں کئی گھنٹے وہ بلند آواز میں چیختا اور روتا رہا۔

اس کی چیخ دپکار سے ریچھوں کے سردار کے آرام میں خلل پڑا۔ چنانچہ صبح کو وہ خود دریافت کرنے کے لیے گیا۔ کہ یہ کون رات بھر چیختا رہا ہے۔ جب اس نے میموں کو اس دردناک حالت میں دیکھا تو اس کا دل بھی پسیج گیا۔ اور اس نے پوچھا کہ اس پر کس نے یہ ظلم کیا ہے؟

میموں نے ریچھوں کے بادشاہ کو اپنے سامنے دیکھ کر اپنا سر تعظیم سے جھکا دیا اور عرض کی۔

عالی جاہ! میں بندروں کے راجا کا وزیرِ اعظم ہوں۔ چند روز پہلے میں اپنے راجا کے ساتھ شکار پر گیا تھا۔ اور جب ہم واپس آئے تو حضور کے حملے کا حال سُنا اور علاقے کے نقصان کو دیکھا۔ میں نے راجا کو تنبیہ کیا کہ وہ زبردست دشمن سے آئندہ محفوظ رہے۔ ریچھ ہم سے کہیں زیادہ طاقتور ہیں۔ یہ سُن کر راجہ مجھ سے

خفا ہوگیا اور مجھے غدّار اور دشمن کہتے ہوئے مجھے یہ سزا دی۔
اتنا کہہ کر میموں پھر اتنی دردناک آواز میں رونے لگا کہ ریچھوں کے سردار کے بھی آنسو نکل آئے۔ آخر اس نے پوچھا۔ "اب بندر کہاں ہوں گے؟"

"وہ صحرائے مردزمے میں ہیں۔ وہاں وہ زبردست فوج جمع کر رہے ہیں۔ یہ لشکر لے کر وہ آپ پر حملہ کرنے واپس آئیں گے۔" میموں نے جواب دیا۔

"تو یہ بات ہے۔" ریچھوں کے سردار نے کہا۔ وہ اس خبر سے خوفزدہ ہوگیا تھا۔
"تمھارے خیال میں انھیں شکست کیسے دی جا سکتی ہے؟" سردار نے پوچھا۔
"بڑا ہی آسان طریقہ ہے؟" میموں نے جواب دیا۔ "اگر آپ دلیری سے کام لیں کاش میری ٹانگیں ہوتیں، تو میں بھی وہاں پہنچ کر کئی بندروں کو ختم کرتا۔"
اگر تم ہماری مدد کرو، تو ہم ان کے ٹھکانے کی طرف کوچ کر دیں۔ ہمیں راستہ دکھاؤ اور نہ صرف ہم اپنا انتقام لیں گے بلکہ تمھارا بدلہ بھی چکائیں گے" سردار نے کہا۔
میموں نے اُن کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ اور اسے ایک قدآور ریچھ کے سر پر بٹھا دیا گیا۔ میموں اپنی چال کی کامیابی سے بڑا خوش ہوا، اور وہ ریچھوں کو صحرائے مردزمے کی طرف لے جانے لگا جہاں بادِ سموم چلتی تھی اور جہاں پر اتنی شدید گرمی پڑتی تھی کہ کوئی جاندار زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔
"تیز چلیے" میموں بار بار ریچھوں کو کہتا۔ صحرا میں انھیں لے جانے کے لیے وہ بڑا بے تاب ہو رہا تھا۔

"تیز چلیے"۔ جلد ہی ہم دشمن کے سر پر ہوں گے۔
وہ انھیں تیز رفتاری سے کوچ کراتا رہا۔ حتّٰی کہ ریچھوں کے پاؤں آبلوں

سے سوجھ گئے۔ اب وہ صحرا میں تھے۔ یہاں سخت گرمی تھی۔ اور ارد گرد پرندے مرے پڑے تھے اور ہر طرف اُجاڑ بیابان تھا۔ اور دُور دور تک کسی بندر کا نام و نشان نظر نہ آتا تھا۔

"کیسی برباد جگہ پر آئے ہو؟" ریچھوں کے سردار نے بڑے غصّے میں میموں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میموں نے جب دیکھا کہ وہ اتنے تھک چکے ہیں کہ ان میں سے کوئی واپس زندہ نہیں جا سکتا تو وہ بڑی جرأت سے بولا:۔

"موذیو! تمھاری تباہی قریب ہے۔ تم صحرائے موت میں ہو۔ دُور، جو تم بگولے دیکھ رہے ہو۔ بس یہی موت ہے، جو تمھیں تمھارے ظلم کی سزا دے گی۔ تم میں سے کوئی بھی بچ کر نہیں جا سکتا۔

ابھی اس نے آخری جملہ پورا ہی کیا تھا کہ بادِ سموم کا زبردست بگولا اٹھا۔ اور اس نے سب کو ختم کر دیا۔ دو دن بعد جیسا کہ میموں نے ہدایت کی تھی، بندروں کا راجا واپس اپنے کنج میں پہنچا۔ وہاں دشمن کا نام و نشان نہ تھا۔ اس کے بعد وہ بڑے اطمینان سے کئی سال حکومت کرتا رہا۔

اور ہاں ـــــ میموں کی قربانی کو ہمیشہ یاد رکھا گیا۔

بلّی اور ایک گدھ

ایک دفعہ کوّے نے چوہے سے کہا "غیر قبیلے کے کسی شخص کو جس کا کردار تمھیں معلوم نہ ہو۔ اپنے گھر میں جگہ نہ دینی چاہیے۔ کیونکہ ایک بار بلّی نے ایک گدھ کو مروا دیا تھا۔

"ایسا کیونکر ہوا؟ چوہے نے حیرانگی سے پوچھا۔

جواب میں کوّے نے یہ کہانی سنائی:۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ گنگا کے کنارے ایک بہت قدیم، بہت بلند اور گھنا پیپل کا پیڑ تھا۔ اس پر ایک گدھ کے کنبے کی رہائش تھی۔ یہ پیپل ایسی موزوں جگہ پر تھا کہ دوسرے ننھے ننھے پرندوں نے بھی اس پر بسیرے بنا رکھے تھے۔ دن بھر یہ چہچہاتے رہتے۔ بھوک لگتی تو آس پاس کے درختوں سے پھل کھاتے۔

اور پیاس لگتی تو گنگا کا پوِتر پانی پیتے تھے۔

گِدھ اپنے بچّوں کا پیٹ پالنے کے لیے دُور دُور مُردہ جانوروں کی تلاش میں جاتا اور گوشت لاکر اپنے بچّوں کا پیٹ پالتا تھا۔ اس طرح پرندے اور یہ گِدھ بڑے مزے کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

ایک بِلّی کا نام گن کُتری تھا۔ وہ چپکے سے ادھر آنکلی اور پاس ہی ایک درخت کے کھوکھلے تنے میں چھپ گئی اور پرندوں کے ننھے ننھے بچّوں کی تاک میں رہتی۔ جب بھی گن کُتری کو موقع ملتا تو وہ بڑے پیپل کے نزدیک آتی اور بے خبر ننھے پرندوں کو آدبوچتی۔ اس طرح پیڑ پر رہنے والے پرندوں کے سب بچّے بِلّی سے ڈرنے لگے۔

ایک روز جب گن کُتری پیپل کے پاس آئی تو گدھ موجود تھا۔ بلّی کو دیکھ کر پرندوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ گدھ بڑی رعب دار آواز میں بولا۔

"اس طرف کون آرہا ہے؟"

یہ سُن کر گن کُتری بہت گھبرائی اور جی میں کہنے لگی کہ اب میری خیر نہیں۔ میں اس دشمن سے بھاگ نہیں سکتی۔ گدھ مجھے دیکھ چکا ہے۔ بہتری اسی میں ہے کہ میں جی کڑا کرکے اس کے پاس چلی جاؤں۔ دل میں یہ فیصلہ کرکے بلّی آگے بڑھی اور کہا:۔

"عالی جاہ! میں ہوں آپ کی باندی۔"

"کون ہو تم؟" گِدھ نے پوچھا

"حضور! مجھ حقیر کو بلّی کہتے ہیں"۔ گن کُتری نے جواب دیا۔

"اگر جان کی خیر چاہتی ہو تو فوراً یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

میرے حضور! اس حقیر باندی کی ایک عرض تو سن لیجیے۔ ویسے آپ مالک ہیں، اگر چاہیں تو میری کھال بھی نوچ سکتے ہیں"۔ بلّی نے نہایت مسکین صورت بنا کر جواب دیا۔

"کہو! کیا کہنا چاہتی ہو! گدھ نے پوچھا۔

جنابِ والا! یہ باندی پوتر گنگا کے کنارے رہتی ہے۔ ہر روز اس میں غسل کرتی ہے۔ اور حضور! میں نے ہر قسم کا گوشت بلکہ مچھلی بھی کھانا چھوڑ دی ہے۔ ہر وقت ایشور سے لَو لگائے پڑی رہتی ہوں۔ یہاں اس لیے حاضر ہوئی تھی۔ کہ حضور جو عقل اور تجربہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اس لیے آپ سے انصاف کرانے کی امید تھی۔ مگر آپ تو مجھے مارنا چاہتے ہیں —— آخر کیوں حضور ایک اجنبی کو مارنا چاہتے ہیں!"

بلّیاں جو نرم گوشت کھانے کی دلدادہ ہوتی ہیں۔ کیا انھیں نازک پرندوں کے درمیان رہنے کی اجازت دی جا سکتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ میں تمھیں یہاں آس پاس دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔

یہ سن کر بلّی نے اپنے کان پکڑے اور سر زمین پر ٹیک کر بولی۔ حضورِ والا شان! میں دھرم شاستر کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں جو دھرم کرم کے کٹھن راستوں پر چل کر اپنے من کو مار چکی ہوں، مجھ میں گوشت کھانے کی تو خواہش ہی مٹ چکی ہے۔ حضور! مجھ پر یقین کیجیے۔ میں سچ کہتی ہوں، بالکل سچ۔"

گِدھ کن کُتری کی باتوں میں آ گیا۔ اور کن کُتری پیپل کے کھوکھلے تنے میں

رہنے لگی۔

چند دنوں کے بعد موقع دیکھ کر بلّی نے پرندوں کے بچّوں کو گھونسلوں سے دبوچا اور پیپل سے کافی دُور جاکر انھیں کھا گئی۔

اس شام جب پرندے دریا کی سیر سے واپس اپنے بسیروں پر آئے، تو انھیں اپنے بچّوں کا کہیں نام ونشان نہ ملا، تو انھوں نے شور سے آسمان سر پر اٹھالیا۔ ہر پرندہ یہی کہتا کہ گدھ کہاں تھا؟ اور اس وقت کیا کر رہا تھا؟

کن کُتری نے جب یہ سُنا تو چپکے سے کِھسک گئی۔

پرندے پیپل کے اِردگرد چکّر لگاتے رہے۔ آخر انھوں نے درخت سے فاصلے پر اپنے بچّوں کی ہڈّیاں اور پَر دیکھے۔ ہر پرندے نے اپنے جی میں سوچا کہ ان کی غیر حاضری میں گدھ ہی ان کے بچّوں کو کھا جاتا ہے۔ اور سب پرندوں نے فیصلہ کیا کہ گِدھ کا کام تمام کر دینا چاہیے۔

یہ فیصلہ کر کے سب پرندوں نے اُونگھتے ہوئے گِدھ پر ایک دم ہلّہ بول دیا۔ اور چند گھڑیوں میں اسے جان سے مار دیا۔

اس لیے میں کہتا ہوں کہ غیر قبیلے کے کسی شخص پر جس کے متعلّق تم کچھ بھی نہ جانتے ہو، اعتبار نہ کرنا چاہیے۔ اور نہ ہی اسے بغیر سوچے سمجھے اپنے گھر میں جگہ دینی چاہیے۔

چین

۱۔ لوسُون ۔ ایک نابینا لڑکا
۲۔ ایک لڑکا جو شہنشاہ بنا

چین کی قدیم تہذیب و تمدّن کی اٹھان کسی بیرونی اثر سے آزاد ہے۔ بابل اور نینوا جب کھنڈرات میں بدل چکے تھے، تو چینی تہذیبی اور تمدّنی ترقی کے مدارج طے کر رہے تھے۔ آج سے دو ہزار سال پہلے جب یورپ میں علم و فن کے ابتدائی نقوش بھی نہ ابھرے تھے، تو چین میں مصوّری، علم استدلال، جمالیات اور فلسفہ و تاریخ پر کتابیں لکھی جا رہی تھیں۔ اس لحاظ سے چین کی قدیم لوک کہانیاں دیگر مشرقی اور یورپی ممالک سے جُدا حیثیت رکھتی ہیں۔

لوسون —— ایک نابینا لڑکا۔ اور ایک لڑکا جو شہنشاہ بنا۔ خاندان سونگ کے عہدِ حکومت کی مشہور کہانیاں ہیں۔ خاندان سونگ کی حکومت قبلد خاندان سے پہلے تھی۔ اس لحاظ سے یہ کہانیاں تقریباً سات سو سال قدیم ہیں۔

لوسون ـــــ ایک نابینا لڑکا

لوسون ایک اندھا لڑکا تھا۔ ملک چین میں دوسرے اندھوں کی مانند نہ اس کا گھر تھا اور نہ کوئی سرپرست۔ اسے اس کے پتھر دل والدین نے گھر سے نکال دیا تھا اب وہ بازاروں میں بھیک مانگ کر زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔ وہ صبح سے رات تک شہر کے گلی کوچوں اور شہر کے مضافات میں چھڑی کی مدد سے پھرتا رہتا تھا۔ اسے راستہ چلنے میں یہ چھڑی بڑی مدد دیتی تھی۔ کچھ عرصہ لوسون شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اور شہر کے نزدیک دیہات میں بڑی آسانی سے جا سکتا تھا۔

لوسون کا ایک وفادار ساتھی فان نامی کتا بھی تھا، جو ہر وقت اس کے ہمراہ رہتا تھا۔ جب لوسون اپنی تین انگلیوں سے اسے اشارہ کرتا تو فان اپنی اگلی

دو ٹانگوں پر جُھک کر تعظیم بجالاتا تھا، جسے چین میں (KOTOW) کوٹو کہتے تھے۔ راہ گیر کتّے کا یہ کرتب دیکھ کر بڑے خوش ہوتے۔ کئی راہ گیر چلتے چلتے رُک جاتے اور اندھے لڑکے کے ہاتھ میں دھیلہ یا دمڑی تھماکر اپنی راہ ہو لیتے۔ کچھ مدّت کے بعد جب لوسُون لاٹھی ٹیکتا ہوُا شہر کی تنگ گلیوں سے گزرتا تو لوگ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے لیے اسے ٹھہرا لیتے تھے۔

ایک شام کا ذکر ہے کہ لوسُون اور اس کا ساتھی فان شہر سے دُور ایک گاؤں سے گزر رہے تھے کہ انھیں شام نے آلیا اور رات بسر کرنے کے لیے انھیں وہیں ٹھہرنا پڑا۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی مرتبہ اس طرح کھُلی فضا میں رات بسر کر چکے تھے۔ اس لیے انھیں کسی قسم کا ڈر نہ تھا۔ وہ دونوں کوئی ایسی جگہ تلاش کرنے لگے جہاں کہ وہ آرام سے لیٹ سکتے۔ لوسُون کے ساتھی فان کو ایک گھنے پیڑ کے نیچے ایسی جگہ دیکھنے میں کوئی دیر نہ لگی۔ اور اس نے عف عف کر کے اپنے ننھّے مالک کو جگہ ملنے کی اطلاع دی۔ جو کتّے کی زبان کے کئی الفاظ جانتا تھا۔ فان لوسُون کو اس آرام دہ جگہ پر لے گیا۔ اور دونوں اس درخت کے نیچے ایک دوسرے سے لپٹ کر سو گئے۔

لوسُون نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ اسے کوئی بڑے ہی دھیمے لہجے میں آہستہ آہستہ پُکار رہا ہے۔

"لوسون، لوسون! کیا تم مجھے دیکھ سکتے ہو؟"

"افسوس!" لڑکے نے بڑے دردناک لہجے میں کہا۔ "مَیں اندھا ہوں"۔

ننھّے دوست واقعی یہ بڑی دردناک بات ہے۔ شاید مَیں تمھاری کوئی خدمت کر سکوں۔

"آہ" لوشون کی زبان سے نکلا اور اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ "میرے مہربان دوست! کیا آپ میری آنکھوں کو روشنی بخش سکتے ہیں؟"

"نہیں میرے بچے نہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ البتہ میں ایک طریقہ بتاتا ہوں۔ جس سے تم اپنی آنکھوں کا نور حاصل کر سکو۔ جو کچھ میں تمھیں بتانے لگا ہوں۔ اسے غور سے سنو۔ اس پر پوری طرح عمل کرنے سے تمھیں آنکھیں واپس مل جائیں گی۔ آج سے جب کبھی تم کوئی نیک کام کرو گے، خواہ یہ نیک کام کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو۔ اور تمھاری آنکھوں کی تاریکی میں روشنی کی ایک کرن پیدا ہو جائے گی۔ اور جیسے جیسے تمھاری نیکیاں بڑھتی جائیں گی۔ اور تم ہر چیز صاف دیکھ سکو گے۔ لیکن تمھیں میرے یہ الفاظ بھی یاد رکھنے چاہییں۔ کہ اگر تم نے رحم دلی اور محبت کی بجائے برے کام کے متعلق سوچا بھی تو نیکیوں سے حاصل کی ہوئی روشنی ضائع ہو جائے گی۔"

اس کے بعد یک لخت یہ اجنبی آواز بند ہو گئی، اور ساتھ ہی لوشون کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے چہرے پر دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اسے دنیا بڑی روشن معلوم ہوئی۔

فان بھی بڑا خوش نظر آتا تھا۔ اس نے اپنے ننھے مالک کے ہاتھ خوشی سے چاٹنے شروع کر دیے۔

"کیا ہم ایسا کر سکتے ہیں فان؟" لوشون نے کتے سے دریافت کیا جیسے کہ وہ بول ہی سکتا تھا۔ اور خواب کی گفتگو سمجھ سکتا تھا۔ کتا اپنے مالک کی آواز سن کر بھونکنے لگا۔

"بہت اچھا! اگر تمھارا خیال بھی ایسا ہی ہے تو مجھے یقین ہے کہ میں اپنی آنکھیں

واپس لے سکتا ہوں۔ تم جانتے ہی ہو کہ میں تمھاری مدد کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتا۔"
یہ کہہ کر لوشون نے کتے کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اور اس سے بڑے پیار سے بغل گیر ہوا۔

پھر دونوں شہر کی طرف چل پڑے۔ راستے میں لوشون خواب میں اس اجنبی آواز کے سوا اور کچھ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ "آہ اگر مجھے بینائی مل جائے، تو میں کتنا خوش ہوں گا۔ میں اپنے ظالم باپ کو بتاؤں گا کہ جسے وہ گھر سے نکال چکا ہے۔ وہ دنیا میں کچھ نہ کچھ بن سکتا ہے۔ میں اس گُم نامی اور ذلت کی زندگی سے ضرور چھٹکارا حاصل کروں گا۔ میں اپنے باپ سے بھی بہتر زندگی بسر کرنے کی کوشش کروں گا۔"

جونہی وہ شہر کے دروازے میں داخل ہوئے، تو دیوار کے ساتھ سڑک کے کنارے لیٹے ہوئے ایک بھکاری سے لوشون کو ٹھوکر لگی۔

"غریب اندھے کو ایک پیسہ دیتے جاؤ بابا!" بھکاری نے التجا کی۔ "مجھ پر رحم کرو بابا۔ ایسے ہی گزر نہ جاؤ بابا۔"

"ہم تو ایک ہی کشتی کے سوار ہیں بھائی۔" لوشون نے جواب دیا۔ "میں بھی آپ کی طرح اندھا ہوں۔"

"افسوس رحم دل لڑکے! میں تم سے زیادہ بدقسمت ہوں۔ میں اپاہج بھی ہوں۔"

انتہائی ترس کھاتے ہوئے اور خواب کے الفاظ یاد کرتے ہوئے لوشون نے ایک پیسہ اس اندھے اور اپاہج بھکاری کو دیا۔ صِرف یہی پیسہ اس کی

کُل پونجی تھی۔
"یہ لو بابا! بس میرے پاس تو یہی ہے" لوشون نے کہا
یک لخت اسے یوں محسوس ہُوا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک چمک پیدا ہوئی۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے گھپ اندھیرا بالکل معمولی کم ہوتا ہُوا معلوم ہوا۔
"خواب سچّا نکلا" لوسون نے خوشی سے کہا
راہ گیروں نے جب اسے اپنے آپ سے باتیں کرتے سنا تو وہ اسے پاگل لڑکا بھی سمجھنے لگے۔ اور اس کے نزدیک سے گزرتے ہوئے وہ اپنا لباس سمیٹنے لگے۔
لوشون نے اس سے پہلے ایسی خوشی محسوس نہ کی تھی۔ اُسے سب دُنیا مسکراتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اور ـــــ اور اس کے دل پر بہار چھا گئی۔
وہ رات اس نے بھکاریوں کے شکستہ مندر میں بسر کی۔ یہ قدیم اور بوسیدہ مندر شہر کے شمالی دروازے کے باہر تھا۔ مدّت ہوئی کہ راہب اس مندر کو چھوڑ چکے تھے۔ اور بھکاریوں نے اسے ٹھکانہ بنا رکھا تھا۔ اس شکستہ مندر کے ایک کونے میں ایک ضعیف بڑھیا بُھوک سے نڈھال پڑی تھی۔ لوشون نے اسے اپنا روٹی کا ٹکڑا دے دیا۔ حالانکہ اس کے کھانے کے لیے صرف یہی روٹی کا ٹکڑا تھا۔ ایک بار وہ یہ محسوس کر کے بڑا حیران ہوا کہ اس کی آنکھوں میں روشنی کی ننھی سی کرن پیدا ہو گئی ہے۔ بہر حال اس رات لوشون اور اس کا ساتھی فان بھوکے ہی سو گئے۔
صبح خالی پیٹ اس کی آنکھ جلد ہی کُھل گئی۔ اور اندھا لڑکا شہر کو جاتی

ہوئی سڑک پر ہولیا۔ ابھی سڑک پر آمد و رفت شروع نہ ہوئی تھی۔ لوشون سوچ ہی رہا تھا کہ بھوک کی اس شدّت کو کیسے کم کیا جائے کہ فان نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ اتفاق سے ایک موٹی تازی مرغی سڑک پر آگئی۔ فان نے جھپٹ کر اسے قابو میں کر لیا۔ خوش قسمتی سے دُور دُور تک کوئی انسانی آواز سنائی نہ دیتی تھی اور نہ ہی کسی گڈّے کے پہیّے کی چوں چوں کی آواز آ رہی تھی۔ لوشون نے کتّے کے مُنہ سے مرغی نکالی۔ تو کتّا اپنی کامیابی پر خوشی سے بھونکنے لگا۔ بیس منٹ کے بعد وہ دونوں دریا کے کنارے والی منڈی میں تھے، جہاں مرغی کو اچھّے داموں فروخت کرنے میں دیر نہ لگی۔ جونہی اس نے مرغی کے دام اپنے ہاتھ میں لیے تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی آنکھوں پر موٹا سیاہ پردہ چھا گیا ہے۔ اس نے اپنی دو نیکیوں سے جو معمولی سا نُور حاصل کیا تھا، وہ ایک دم اس سے چھن گیا۔ اب اس کی آنکھیں اس طرح بے نور اور بے حس تھیں، جیسی کہ درخت کے نیچے خواب آنے سے پیشتر تھیں۔

لوشون جلد ہار ماننے والا لڑکا نہ تھا۔ اس نے فوراً اپنے گناہ کو تسلیم کر لیا اور فیصلہ کیا کہ وہ مرغی کے مالک کو تلاش کرے گا۔ وہ سارا دن بھکاریوں کے مندر کے گرد چکر لگاتا رہا۔ اور ہر راہ گیر سے پوچھتا کہ کسی نے ایسا آدمی تو نہیں دیکھا جس کی مرغی گم ہو گئی ہو۔ شام کو اس کی ننھّی ٹانگیں تھک کر چوُر ہو گئیں اور اس کا چہرہ جو ہمیشہ پُر رونق رہتا تھا، افسوس اور پریشانی سے مُرجھا گیا۔ بھُوک کی وجہ سے صبح جو اسے تکلیف ہو رہی تھی، اب اس سے کمزوری اور غنودگی چھانے لگی۔ پھر بھی اس نے مرغی کے داموں سے ایک پائی بھی خرچ نہ کی۔ دوسری صبح جب

اس کی آنکھ کھلی تو وہ یہ محسوس کر کے بہت خوش ہوا کہ اس کی آنکھوں میں روشنی کی ایک کرن پیدا ہو گئی ہے ۔ظاہر ہے کہ اس کا دلی افسوس ضائع نہیں گیا بلکہ اسے اس کا صلہ مل گیا۔

کئی ہفتوں کی مسلسل کوشش سے یعنی چھوٹے چھوٹے نیک کاموں کی وجہ سے وہ اتنا کامیاب ہو گیا تھا کہ اسے سڑک پر چلتے ہوئے آدمی سایہ سا نظر آنے لگے تھے ۔اس کے علاوہ وہ غروب آفتاب کا نظارہ بھی کر سکتا تھا۔اب اس نے یہ پکا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ ایک ایک کوڑی جمع کر کے ایسا چشمہ خریدے گا جس کے متعلق اس نے لوگوں سے سنا تھا کہ کمزور آنکھوں والے اسے استعمال کرتے ہیں ۔

ایک روز اس کا سامنا اس اندھے اور اپاہج بھکاری سے ہوا جسے اس نے پہلے پہل ایک پیسہ دیا تھا۔ اور جو اس کے پاس آخری پیسہ تھا۔

" افسوس میرے پاس کچھ نہیں" لوشون نے بھکاری کی التجا سننے کے بعد کہا۔ حالانکہ اس کے پاس چند پیسے تھے ۔اس نے پھر کہا " میرے پاس کچھ بھی نہیں ۔ میں تمھاری مدد نہیں کر سکتا۔"

" میں بھوک سے مر رہا ہوں"۔ بھکاری نے پھر منت کی ۔

" میں بھی بھوکا ہوں " لوشون نے جواب دیا ۔ یک لخت اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی اور پھر گہری تاریکی چھا گئی ۔

ایک دفعہ پھر لوشون بڑی محنت سے حاصل کی ہوئی معمولی سی روشنی بھی کھو بیٹھا۔ اب اس کا دل ٹوٹ گیا۔ وہ بڑا ہی مایوس ہوا۔ اس نے اپنی

طرف سے پُوری کوشش کی تھی کہ وہ گناہ کے بغیر پُوری زندگی بسر کر سکے اِس لیے اس نے کئی چیزیں اپنے اوپر حرام کر رکھی تھیں۔ مگر اسے انعام کیا ملا؟ معمولی روشنی بھی اس سے چھین لی گئی۔

''یوں ہی میں کچھ حاصل کرتا ہوں'' لوسون مایوسی میں سوچنے لگا۔"تو ساتھ ہی مجھ سے چھن بھی جاتا ہے۔'' وہ قطعی طور پر نااُمید ہوگیا۔ اور اس نااُمیدی میں دریا کی طرف چل پڑا۔ وہ دریا کے کنارے بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ رہ رہ کر اسے یہی خیال ستاتا تھا۔ کہ اس کی تمام کوششیں ہمیشہ اکارت جائیں گی۔

اتنے میں لوگوں کا شور بلند ہوُا۔ بچاؤ! بچاؤ! وہ دیکھو ایک آدمی ڈوب رہا ہے۔ لوسُون یہ سُن کر حیران ہوا کہ ہر شخص یہی کہہ رہا ہے۔ بچاؤ۔ بچاؤ۔ لیکن کوئی بھی آگے بڑھ کر اس کی مدد نہیں کرتا۔ بے چارہ غوطے پہ غوطہ کھا رہا ہوگا۔ کسی نے چیخ کر کہا کہ چونکہ دریا طغیانی پہ ہے اس لیے دریا میں اُترنے کی کسی کو ہمّت نہیں ہوتی۔

لوسُون نے اپنے ساتھی فان کو کہا "کیوں بھائی! تم ڈوبتے آدمی کی مدد کروگے"۔ فان نے عف عف کرکے ہاں میں جواب دیا۔ اور بھاگ کر دریا میں چھلانگ لگا دی۔

ڈوبتے ہوئے آدمی کے پاس پہنچنے میں فان کو بڑا زور لگانا پڑا۔ پانی کا دھارا بہت تیز تھا۔ جتنا وہ آگے بڑھتا، پانی اسے پیچھے دھکیل دیتا۔ آخر وہ آدمی کے پاس پہنچ ہی گیا۔ اور اپنے مُنہ میں اس کا لباس پکڑ لیا۔

کنارے پر کھڑے لوگوں نے خوشی کا ایک نعرہ بلند کیا۔ اب فان کنارے کی طرف تیرنے لگا۔ لیکن پانی کے زور کے آگے اس کی پیش نہ چلتی تھی۔

لوشون کو لوگوں کی باتوں سے معلوم ہوا کہ فان کی ہمّت جواب دے رہی ہے۔ اس نے چیخ کر کہا "فان بھائی ہمّت کرو۔"

فان نے اپنا آخری زور لگا دیا۔ اور جب وہ کنارے کے قریب پہنچا تو لوگوں نے ایک بانس آگے بڑھا دیا۔ ڈوبتے ہوئے آدمی نے بانس کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور فان نے اس کا لباس چھوڑ دیا۔ عین اس وقت پانی کا ایک زبردست ریلا آیا اور نڈھال فان کو بہا کر لے گیا۔

بے چارے کتّے نے آدمی کی جان بچائی۔ لیکن اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

جب لوشون کے کان میں یہ آواز پڑی، تو وہ چیخ کر دریا کی طرف بڑھا لیکن ایک شخص نے اسے جلدی سے قابو میں کر لیا۔ "صبر کرو بھائی! تمھارا کتّا بچ نہیں سکتا۔"

لوشون ریت پر اوندھے لیٹ کر زار و قطار رونے لگا۔ اس حالت میں وہ کتنی دیر روتا رہا۔ اس کا اسے احساس نہ تھا۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ اور جب اس نے اپنا سر اٹھایا تو ہیں یہ کیا؟

اُسے ایک آدمی اپنی طرف آتا نظر آیا۔ وہ آدمی جوں جوں اس کے قریب آتا، چہرے کے نقوش اسے صاف نظر آنے لگے۔ آخر وہ اس کے قریب آکر رکا اور اسے اٹھا کر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔

" میرے بیٹے لوشون ۔ تمھارے ساتھی فان نے میری جان بچائی ہے"۔

یہ لوشون کا باپ تھا ۔

اب لوشون کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ اپنے ساتھی فان کی جدائی کے لیے روئے یا اپنی آنکھوں کے نور کی وجہ سے ہنسے ۔ یا پھر اپنے والد سے ملنے پر خوشی کا اظہار کرے ۔

لوشون کے باپ نے اس سے اپنی زیادتیوں کی معافی مانگی ۔ اور پھر باپ بیٹا گھر کی طرف روانہ ہوئے ۔

ایک لڑکا ـــــــ جو شہنشاہ بنا

چین کے دُور دراز پہاڑی علاقے میں ایک لڑکا یُوشن اپنے والد، ماں اور بھائی کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا۔ یُوشن ایک نیک دل لڑکا تھا لیکن عجیب وغریب وجوہات کی بنا پر والدین اس سے بہت بُرا سلوک کرتے تھے۔ اس کا چھوٹا بیٹا جو ضدّی، نکمّا اور علیل رہتا تھا۔ وہ اپنے والدین کی محبّت کا مرکز تھا۔ اس کے برعکس یُوشن بڑا ہی خوش نصیب ہوتا۔ جس روز وہ پٹنے سے محفوظ رہتا۔

یہ لڑکا اس بے رحم گھرانے سے کبھی کا بھاگ گیا ہوتا اگر اس کا تجربہ کار استاد نہ ہوتا۔ یہ استاد کنفوشش کے قواعد پڑھاتا تھا جس کی رُو سے ہر چینی لڑکے اور لڑکی کا فرض ہے کہ وہ ہر حالت میں اپنے والدین

سے محبّت کرے اور ہمیشہ ان کا فرمانبردار رہے۔

اس طرح یُوشن کو یقین ہو چکا تھا کہ سب والدین اپنے بڑے بچوں سے سختی سے پیش آتے ہیں۔ لہذا بڑے بیٹے کو مار پیٹ خاموشی سے برداشت کرنا سیکھنا چاہیے۔ جب کبھی وہ اپنے لڑکے کو دیکھتا جس کا والد اپنے بیٹے سے محبّت سے پیش آتا تو یوشن اس آدمی کو عجیب و غریب خیال کرتا۔ اور وہ حیران اور مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھتا رہتا۔

بچپن میں ایک روز یوشن کو غیر معمولی طور پر بُری طرح پیٹا گیا۔ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ جب اس کا باپ کسی بات پر ناراض ہو رہا تھا۔ یہ اس کے سامنے آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی والد نے اسے بُری طرح مارنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد یوشن اپنے سفید ریش استاد کے پاس گیا، جسے وہ اپنا حقیقی دوست سمجھتا تھا۔ اور اپنی بپتا گوش گزار کر کے اس سے پوچھا۔" آدمی اپنے بیٹوں پر اتنا ظلم کیوں کرتا ہے"؟ بزرگ نے بڑی افسردگی سے اپنے مُرجھائے ہوئے ہاتھ اس کے سر پر پھیرتے ہوئے جواب دیا۔" میرے عزیز! جو سوال تم پوچھ رہے ہو، وہ اتنا ہی پُرانا ہے جتنی کہ یہ دنیا۔ جب سے آدمی تخلیق ہوا ہے۔ اس وقت سے اس کے دل میں بُرائی موجود ہے۔ سب آدمی تمھارے والد کی مانند تو نہیں ہوتے۔ لیکن افسوس! اکثر آدمی اپنا نفرت کا ہاتھ معصوموں اور کمزوروں پر اٹھاتے ہیں۔ میرے بچے اس انداز سے جینے کا تہیّہ کرو۔ کہ کسی روز اگر تمھارا والد زندہ رہا، تو وہ نہیں

دیکھ کر شرمندہ ہو جائے، اور افسوس کرے کہ وہ تم سے کتنا بُرا سلوک کرتا رہا ہے۔ اتنی بلندی پر پہنچنے کا ارادہ کرلو کہ تمھیں یہ چھوٹے چھوٹے مصائب کسی قسم کا نقصان نہ دے سکیں۔

"لیکن میرا چھوٹا بھائی!" یوشن بے قراری سے بول اٹھا۔ "آخر اس کے ساتھ مجھ سے بہتر سلوک کیوں کیا جاتا ہے؟ ہر روز وہ والدین کی نافرمانی کرتا ہے، گھر سے بھاگ جاتا ہے۔ اگر اس سے کسی کام کو کہا جائے تو وہ ٹکا سا جواب دیتا ہے۔ اور مدرسے میں اس کی تعلیم کا حال تو آپ جانتے ہی ہیں۔ اور پھر بھی میرے والد اس کی طرف داری اور حمایت یوں کرتے ہیں کہ جیسے وہ دیوتا ہیں اور میں ایک بھکاری۔"

"افسوس! میرے بچے یہ بھی سچ ہے۔ مشہور ہے کہ نیکی اکثر ایک سست رفتار گھوڑے کی مانند ہوتی ہے۔ لیکن دوڑ میں جیت ہمیشہ اسی کی رہتی ہے۔ شروع میں تو بدکار آندھی کی مانند تیز رفتار ہوتے ہیں۔ لیکن انھیں ٹھوکر یقیناً لگتی ہے۔ اور وہ گرتے کبھی ضرور ہیں —— ہمّت کرو! دل کو اپنے بھائی کی طرف سے میلا نہ کرو۔ میرے الفاظ یاد رکھنا کہ وہ گم نامی میں مرے گا۔ جب کہ تم! یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا کہ تم کتنا بلند مقام حاصل کرو گے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ عظیم سے عظیم تر مقام تمھارا منتظر ہے۔"

یُوشن مطمئن ہو کر اپنے بزرگ استاد سے رخصت ہوا۔ اور اس نے دل میں فیصلہ کر لیا۔ کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو وہ بہادروں کی طرح ہر مصیبت برداشت کرے گا۔

عجیب بات ہے کہ اسی رات جب کہ وہ اپنے استاد سے مل کر آیا تھا تو اس نے والدین کو اپنے خلاف سازش کرتے سنا۔

"یہ لڑکا تو مجھے بس زہر لگتا ہے"۔ ماں نے شکایت کی۔ "اب میں اسے برداشت نہیں کر سکتی"۔

"میں بھی نہیں"۔ اس کے باپ نے ترشی سے جواب دیا۔ "یہ ہمارے خاندان کے لیے زیب نہیں دیتا۔ کل اس کا قصّہ ہی چکا دیں"۔

کیوں نہ اسے بازی گروں کے ہاتھ فروخت کر دیں"۔ ماں نے تجویز پیش کی۔ "اس طرح کچھ نہ کچھ رقم بھی ہاتھ لگ سکتی ہے"۔

تجویز تو اچھی ہے۔ بشرطیکہ ہمیں یقین ہو جائے کہ وہ ان سے فرار نہ ہو جائے اور غیر متوقع طور پر پھر یہاں نہ آ جائے۔ پہلے ہمیں اس بات کا یقین حاصل کر لینا چاہیے۔

اس کے بعد یوشن کوشش کے باوجود ان کی سرگوشیاں نہ سن سکا۔ خوف سے کانپتے ہوئے اپنے سخت بستر پر والدین کے خوف ناک ارادے پر غور کرتا رہا۔ وہ صبح گھر سے بھاگنے کے متعلق سوچتا رہا۔ لیکن اسے کوئی راہِ فرار نہ سوجھی۔ کیا کوئی ایسی طاقت نہیں جو اس کا تحفّظ کر سکے۔ اس نے بستر ہی پر دیوتاؤں سے التجا کی کہ وہی اس کی مدد کریں۔ پھر جلد ہی اس پر نیند چھا گئی۔

اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک حسین اور بڑی پیاری سی پری اس کے بستر کے اوپر چکّر لگا رہی ہے۔ اور پھر اس نے اس کے ابرو کو چھوتے ہوئے کہا

"یوشن! یوشن! ڈرو نہیں تمھارا دل نیک ہے اور تمھیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

صبح کو وہ بیدار ہوا اور بڑے اطمینان سے اپنے کام کاج میں مصروف ہو گیا۔ اتنے میں اس کا والد آیا اور اس سے کہنے لگا کہ ایک کدال کوئیں میں گر گئی ہے۔ وہ اسے نکال لائے۔ یہ کنواں مدت سے خشک ہو چکا تھا۔

حالانکہ اسے خوف تھا کہ یہ حکم اس کے خلاف سازش ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر بھی وہ بغیر پس و پیش رسّے کو پاس کے درخت کے ساتھ مضبوطی سے باندھ کر اس کے ذریعے کوئیں میں اتر گیا۔ جونہی اس کے پاؤں زمین پر لگے، تو اسے اُوپر سے ایک خوف ناک ہنسی کی آواز آئی۔ اُس نے اُوپر دیکھا۔ اس کا چھوٹا بھائی رسّہ کھینچ رہا تھا۔ دوسرے لمحے یُوشن کے اوسان خطا ہو گئے کہ اس گہرے گڑھے میں اُوپر سے چکّی کا ایک بڑا پتّھر گر رہا ہے۔ اگر اس کا بچنا ممکن بھی ہوتا تو پھر بھی سوچنے کی مہلت ہی نہ ہوتی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پتّھر کے گرنے کا انتظار کرنے لگا۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ پتّھر پڑنے سے وہ پس جائے گا۔ عین اسی وقت اس نے آواز سُنی:

"یوشن! ڈرو مت! نظر اٹھاؤ اور دیکھو!"

اُس نے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ چکّی کا سفید گول پتّھر یک لخت پری میں بدل گیا تھا۔ اور پری اپنے بازو پھیلائے خلا میں تیر رہی تھی اور اسے کہہ رہی تھی اپنے ہاتھ میرے ہاتھوں میں دے دو۔ سب ٹھیک ہی ہوگا۔

یُوشن دوبارہ سننے کے لیے بھی نہ رُکا۔ بلکہ جونہی اس نے پری کے ہاتھوں کو چھوا تو دوسرے لمحے وہ زنّاٹے سے کوئیں کے باہر تھا۔ عین اس وقت

اس کا بھائی جھونپڑی کی طرف جا رہا تھا۔ جو اپنی حرکت سے بڑا خوف زدہ تھا اور چلنے کی بجائے دوڑ رہا تھا۔

ممنونیت اور تشکر کے جذبات سے وہ اپنی نجات دہندہ کی طرف مڑا۔ لیکن یہ کیا؟ یہ وہی چکر کا پتھر اپنی پرانی جگہ پہ پڑا تھا۔ اور اس پر ایک خوبصورت سفید پھول کھل رہا تھا۔ اس نے پھول اٹھالیا۔ اس کی پتیوں پر یہ الفاظ چمک رہے تھے :۔

حوصلہ رکھو!

رسّہ بھی ایک ڈھیر کی صورت میں وہیں پڑا تھا جہاں اس کا بھائی چھوڑ گیا تھا۔ اسے اٹھا کر یوشن گھر کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو اس نے سنا کہ اس کا والد چھوٹے بھائی کے خوف کی ہنسی اُڑا رہا تھا۔ اس کی ماں پیالوں میں چاول ڈال رہی تھی۔

"کدال کوئیں میں نہیں آیا"۔ یوشن نے اطمینان سے کہتے ہوئے رسّہ ایک کونے میں رکھ دیا۔ جیسے کہ کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہوا۔ اور اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

"تم نے وہاں کچھ نہیں دیکھا؟" اس کے بھائی نے خوف سے کانپتے ہوئے اور خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں البتہ گھسا ہوا چکّی کا پاٹ پڑا تھا۔ جہاں ہم بیٹھ کر کھیلا کرتے تھے"۔ یوشن نے جواب دیا "میں نے سوچا کہ شاید تمھیں اس کی ضرورت ہو۔ اس لیے پتھر کوئیں کے باہر ہی پڑا ہے"۔

حالانکہ یُوشن نے باپ کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اس نے اتنا وزنی پتھر خود کوئیں سے باہر نکالا ہے۔ بہرحال اسے یقین ہوگیا کہ بھاری پتھر یوشن نے خود ہی کوئیں سے نکالا ہے۔ اور اسے یقین ہوگیا کہ یوشن کسی بدرُوح کے زیرِ اثر ہے۔ اس لیے اس نے تہیّہ کر لیا کہ اب وہ یُوشن کو جیتا نہ چھوڑے گا۔ کیونکہ یہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کہ کس وقت وہ اپنے والدین کے خلاف ہو جائے۔ اسے یہ گوارا نہ تھا کہ کسی صورت میں اس کا بیٹا اس سے زیادہ طاقتور ہو۔ اس وقت تو اس نے یُوشن کو کچھ نہ کہا۔ بلکہ بڑی نرمی سے پیش آیا تاکہ وہ اس کی نیّت پر شک نہ کر سکے۔

اس واقعہ کے چند روز تک یوشن اپنا کام بڑے اطمینان سے کرتا رہا۔ اب اسے چھوٹا بھائی بھی تنگ نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ وہ پرلے درجے کا بزدل تھا اور کوئیں والے واقعہ کے بعد وہ یوشن سے خوف زدہ رہتا تھا۔

یُوشن کو معلوم تھا کہ اس کے والدین اس کے خلاف سازش میں مصروف ہیں۔ کیونکہ نرم کلامی کے باوجود اسے اتنا کام دیا جاتا کہ اسے ایک منٹ آرام ملنا مشکل ہوگیا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ وہ جھونپڑی سے دُور کھیت میں ایک چھوٹی سی کوٹھری میں چارہ کاٹ رہا تھا۔ سخت گرمی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد وہ سستانے کے لیے بیٹھ جاتا۔ ایک بار اس پر نیند نے اتنا غلبہ کیا کہ وہ وہیں فرش پر لیٹ کر سو گیا۔

اسے سوئے ہوئے کوئی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ وہ بڑبڑا

کر اٹھ بیٹھا۔ دیکھتا کیا ہے کہ کوٹھری کے چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے اور لحظہ بہ لحظہ شعلے اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اتنے میں آواز آئی۔

"یوشن! لیٹ جاؤ۔ آگ تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔"

وہ زمین پر لیٹ گیا اور اس کی حیرانگی کی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے دیکھا کہ اس سے تھوڑے فاصلے پر تو آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ لیکن جس جگہ پر وہ لیٹا تھا وہاں آنچ تک نہیں پہنچتی بلکہ اسے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔

پھر آواز آئی۔

"یوشن! سو جاؤ اور ڈرو نہیں۔"

اس نے اطمینان سے آنکھیں بند کر لیں۔ اور اس جہنم میں بھی اُسے گہری نیند نے آ لیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو والد اور بھائی اس کے سر پر کھڑے تھے۔ اسے زندہ سلامت دیکھ کر تو ان کے اوسان خطا ہو چکے تھے۔

"کیا — کیا ہوا ہے؟ یوشن نے بڑی بے پرواہی سے پوچھا۔" کیا یہاں آگ لگی تھی؟ میں تو خواب میں سمندر کے کنارے لیٹا تھا۔ اور پانی کی ہلکی ہلکی لہریں مجھے چھو رہی تھیں۔

باپ بیٹا اسے آنکھیں پھاڑے چُپ چاپ دیکھتے رہے۔ یوشن ان سے یقیناً مختلف تھا۔ اور یہ بھی صاف ظاہر تھا کہ دیوتا اسے اپنی امان میں لے چکے تھے۔ اس دن کے بعد انھوں نے اسے جان سے مارنے کا ارادہ ترک

کر دیا۔

دوسرے روز والد نے یوشن کو بلایا اور کہا "یہ جگہ ہم سب کے لیے چھوٹی ہے اور ہم آرام سے اس چھوٹی سی جھونپڑی میں نہیں رہ سکتے۔ اب تم جوان ہو گئے ہو۔ شادی کرکے اپنا الگ گھر بنالو۔ اس پہاڑ کی اترائی میں میری کچھ زمین ہے وہ تمھیں دیتا ہوں اور اس زمین کی ملکیت کے کاغذات بھی تمھارے نام کرا دیتا ہوں۔ اس سے جو کچھ پیدا کرو گے اس کے تم واحد مالک ہو گے۔ ہمارے ساتھ رہنے کی بجائے وہاں تم بڑے مزے سے رہو گے۔"

یوشن جانتا تھا کہ جس زمین کا والد ذکر کر رہا ہے وہ بڑی سخت اور پتھریلی زمین ہے۔ وہاں کھیتی باڑی تو ناممکن ہے۔ اس کا والد بنجر اور بے کار زمین دے کر یوشن سے ہمیشہ کے لیے خلاصی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور اس طریقے سے اس کا چھوٹا بھائی اصل جائیداد کا مالک بن جائے گا۔ جو پتھریلی زمین کے ٹکڑے سے سو گنا زیادہ تھی۔

دوسرے روز یوشن والدین اور بھائی سے رخصت ہو کر نئی جگہ پر چل پڑا جب وہ زمین پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ جتنی خراب زمین وہ سمجھتا تھا اس سے کہیں زیادہ خراب اور بے کار نکلی۔ اگر بیس آدمی دن رات اس زمین پر کام کرنے لگیں تو پھر بھی پتھر، جڑیں اور جھاڑیوں سے اس زمین کو صاف نہیں کر سکتے تھے۔ اگر کسی نہ کسی طرح اناج بویا بھی جاتا تو پھر بھی ایک آدمی کا پیٹ بھرنا مشکل ہوتا۔ یوشن کے سامنے یہ کٹھن کام تھا۔ مگر وہ ارادہ کرکے اٹھا اور پری سے مدد مانگ کر زمین صاف کرنے لگا۔ اتنے میں دیکھتا کیا ہے کہ دور ایک سیاہ

بگولا اٹھا جو دم بدم اس کی طرف بڑھنے لگا۔ جب یہ بگولا اس کے سامنے آگیا تو اس میں بسے ہاتھیوں کا ایک گلّہ اور میناؤں کا ایک جھنڈ برآمد ہوا اور ساتھ ہی اس کے کان میں ایک آواز آئی۔

" دیکھو! کھیت کے جانور اور ہوا کے پرندے تمھاری مدد کو آگئے ہیں۔ حکم دو! یہ تمھارا حکم بجالائیں گے۔ انھیں راہ دکھاؤ۔ یہ تمھاری پیروی کریں گے"۔

یوشن نے پری کا شکریہ ادا کیا اور ہاتھیوں اور میناؤں کی مدد سے زمین صاف کرنے لگا۔ ہاتھیوں نے زمین سے بڑے بڑے پتھر اکھیڑ کر چاروں طرف اس طرح رکھ دیے کہ ایک قسم کی دیوار سی بن گئی۔ اس کے بعد سڑی ہوئی بڑی بڑی جڑیں زمین سے اکھیڑلیں۔ اور اس طرح تھوڑی دیر بعد زمین صاف اور ہموار ہوگئی۔ میناؤں نے اپنی چونچوں سے چھوٹے چھوٹے کنکروں سے زمین کو صاف کرنا شروع کیا۔ اور پھر چونچیں مار مار کر زمین کو نرم کردیا۔ بنجر اور بے کار زمین جو کچھ عرصہ پہلے ایک تندرست آدمی کے لیے بھی اناج مہیا نہیں کرسکتی تھی۔ اب زرخیز اور وسیع کھیت میں بدل گئی۔ اور زمین کا مالک بڑے آرام سے زندگی بسر کرسکتا تھا۔

جب مینائیں اور ہاتھی اپنا کام ختم کرچکے، تو ایک قطار بنا کر یوشن کے سامنے گزرنے لگے۔ یوشن کے شکریے کے جواب میں ہر ہاتھی نے اپنا سر جھکایا اور میناؤں نے اس کے سر پر تین چکر لگائے اور جس طرح آئے تھے اسی طرح نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

یوشن نے زمین پر گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر شکریے کی دُعا مانگی اور پھر

اپنی شکستہ جھونپڑی میں گیا۔ یہ جھونپڑی پہلی جیسی نہیں رہی تھی۔ بلکہ اب تو وہ ایک اچھے خاصے زمیندار کا جھونپڑا معلوم ہوتا تھا۔ وہ اپنے اس نئے مکان کا جائزہ ہی لے رہا تھا۔ کہ اسے کھیت کی طرف سے ۹ نوجوان آتے ہوئے نظر آئے۔ ان کے پیچھے گدھے پر سوار ایک خوبصورت لڑکی بھی آ رہی تھی۔ وہ سیدھے اس کے پاس آئے اور اس کے سامنے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

"اپنا سر بلند کیجیے۔ میں کوئی بڑا آدمی نہیں کہ آپ میری یوں تعظیم کریں۔"

یوشن نے ان سے کہا۔

نوجوانوں میں سے بڑے نے آگے بڑھ کر کہا۔ "محترم! ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ مہربانی کر کے ہمیں اپنا ملازم رکھ لیں۔ آپ کے کھیت کے لیے ہل چلانے والوں اور آپ کی چار دیواری کے لیے مزدوروں کی ضرورت ہے۔ ہم آپ کا ہر حکم بجا لائیں گے۔"

یہ سن کر یوشن اتنا حیران ہوا کہ وہ ان سے کوئی سوال ہی نہ کر سکا۔ اور انھیں کمرے میں لے گیا۔ اور جو کچھ میز پر موجود تھا وہ کھانے کے لیے پیش کر دیا۔

دوسرے روز یوشن نے اس لڑکی سے شادی کر لی اور اس نے مختلف کام نوجوانوں کے سپرد کر دیے۔ اس طرح کافی مدت تک یوشن کی سرپرستی میں نوجوان ایک خاندان کی طرح زندگی بسر کرتے رہے۔ اس کے سرسبز کھیت کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور سب لوگ یوشن کی قابلیت اور محنت کی تعریف کرنے لگے۔ اس کا والد اور بھائی اسے کوئی نقصان تو نہیں پہنچا سکتے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ بدستور اس سے نفرت کرتے رہے۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ سپاہیوں کا ایک دستہ یوشن کے گھر پر پہنچا اور سپاہیوں کے سردار نے یوشن کو شہنشاہِ چین کے دربار میں حاضر ہونے کا حکم نامہ دکھایا۔ یوشن کو سمجھ نہ آئی، کہ اس کی طلبی کا حکم کیوں آیا ہے۔ تاہم وہ پس و پیش کیے بغیر سپاہیوں کے ساتھ چل پڑا۔ اس کے ساتھ اس کی بیوی اور نو ملازم بھی تھے۔ سفر کے دوران میں سپاہی یوشن سے ایسے پیش آتے جیسا کہ وہ کوئی معمولی کسان نہیں بلکہ ایک بادشاہ ہو۔

گیارہ دن اور گیارہ راتیں سفر کے بعد بارھویں روز سپاہیوں نے اشارے سے دور شہنشاہ کے عالی شان شہر کی دیواریں دکھائیں اور پہلی مرتبہ یوشن کو خوف محسوس ہونے لگا۔ حالانکہ اسے یقین تھا کہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا۔ عین اس وقت اس کے کان میں پری کی آواز آئی۔

"گھبراؤ نہیں سب ٹھیک ہو گا۔"

جب وہ محل کے دروازے پر پہنچے تو ایسا معلوم ہوا کہ ان کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ یوشن کو کئی دیوان خانوں سے گزارتے ہوئے ایک بڑے کمرے میں لے گئے۔ جہاں شہنشاہِ چین تخت پر رونق افروز تھے۔

یوشن نے تختِ چین کی تعظیم بجالانے کے لیے سر جھکا دیا۔ اس کے عقب میں نیم دائرہ بنا کر ۹ نوجوان اور اس کی بیوی سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

شہنشاہ نے فرمایا۔

"یوشن! اپنا سر اٹھاؤ! دیکھو! ہم تمھیں وہ انعام دینے والے ہیں جس سے زیادہ ہم کچھ نہیں دے سکتے۔ ہم ضعیف ہو چکے ہیں۔ اور اب ہم چاہتے ہیں کہ

اس وسیع سلطنت کی ذمّہ داریوں کا بوجھ یوشن تم اپنے مضبوط کندھوں پر اٹھالو۔"
ان الفاظ سے یُوشن بہت ہی حیران ہوا۔ اور شہنشاہ کی طرف دیکھنے لگا۔
"یوشن" شہنشاہ بولے "ہمیں ایک ایسے نوجوان کی ضرورت تھی جو رحمدل اور ذمّہ دار ہو۔ جو مصائب کو مردانہ وار برداشت کر سکتا ہو۔ اور معاملات کو سلجھا سکتا ہو۔ یُوشن تم اپنے امتحان میں پُورے اُترے۔ تم نے اپنے والدین کی سختیاں برداشت کیں۔ تمھارا استاد ہمارا وزیر تھا۔ جو سلطنت میں نیک دل لڑکے کی تلاش میں نکلا تھا۔ جب ہم نے تمھیں بہادر اور ذمّہ دار پایا تو ہم نے اپنے نو بیٹے اور ایک بیٹی تمھاری خدمت کے لیے بھیجے۔ ہم خوش ہیں کہ تم نے حُسنِ انتظام سے ہماری نظروں میں وہ مقام پیدا کر لیا ہے۔ جس کا انعام یہی ہے کہ تم اس مقدّس تخت کے وارث بن گئے ہو۔"
یُوشن نے تین مرتبہ جھک کر تخت اور شہنشاہ کو فرشی سلام کیا۔
"یوشن! ہمیں اُمید ہے کہ تخت حاصل کر کے تمھارا دل اور تمھارا سر غرور اور تکبّر سے نہیں بھرے گا۔ اور تم اتنی بڑی سلطنت کا کاروبار اُسی پیار سے چلاؤ گے جس طرح تم نے گھر کا بندوبست کیا تھا۔"
اس طرح ایک چینی لڑکا یُوشن —— شہنشاہِ چین بنا۔

عرب

۱۔ سونے کا طشت اور ایک کتا۔
۲۔ ایک مفلس کا خواب۔

دُنیا کی سب سے بڑی لوک کہانیوں کی کتاب "الف لیلےٰ" ہے۔ ان کہانیوں کو کتاب کی صورت، آج سے تقریباً آٹھ سو سال پہلے دی گئی۔ محققین اس کتاب کو لوک کہانیوں کا سب سے پہلا مجموعہ تسلیم کرتے ہیں۔
قصّہ کہنے کے فن میں نکھار پیدا کرنے میں "الف لیلےٰ" کا بڑا حصّہ ہے۔ مشرق خصوصاً مشرقِ وسطیٰ کے تمام دیگر ایسے قصّے اس کتاب ہی کے خوشہ چیں ہیں۔
" سونے کا طشت اور ایک کتا" عربوں کے مخصوص تمدّن اور تصوّرات کا ایک عکس ہے۔ یہ کہانی بھی الف لیلےٰ سے لی گئی ہے۔
دولت و امارت ہرجائی ہوتی ہے۔ یہ اعتقاد صدیوں پُرانا ہے اور اس اعتقاد کو موجودہ زمانے کی مادیت بھی دُور نہیں کرسکی۔ یہ چھوٹی سی کہانی عربوں کے کلچر کی ایک جامع تصویر ہے۔

سونے کا طشت اور ایک کُتّا

اے شہنشاہوں کے شہنشاہ! آج رات میں جہاں پناہ کو ایسی کہانی سناتی ہوں، جس میں دولت کے کرشمے اور مفلس کی کرامات موجود ہیں۔

مدت ہوئی ایک سوداگر اپنے مال و اسباب میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ قسمت کی بات دیکھیے کہ کچھ عرصے بعد وہ ایسا مقروض ہو گیا کہ اگر وہ اپنی تمام دولت اور سامان فروخت بھی کر دیتا تو وہ قرضے سے سبکدوش نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ایک رات وہ چپکے سے اٹھا اور اپنا گھر بار اور مال و متاع چھوڑ کر شہر ہی سے نکل گیا۔

کئی سال تک وہ در در کی خاک چھانتا رہا۔ مگر اسے کہیں امان نہ ملی، کہیں اطمینان نصیب نہ ہوا۔ اسے کوئی موقع بھی نہ مل سکا کہ وہ چھوٹا موٹا کاروبار

ہی کر لیتا۔ گھومتے گھومتے وہ ایک شہر میں جا نکلا۔ جس کے گرد بلند اور مضبوط فصیل کھڑی تھی۔ اور اس فصیل میں شہر سفید براق کی مانند نظر آتا تھا۔ وہ اس شہر میں بڑی بدحالی اور بڑی ہی مایوسی سے داخل ہوا۔ طویل اور کٹھن مسافت نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ اب اس کی حالت یہ تھی کہ اسے چار قدم چلنا مشکل ہو رہا تھا۔

بہرحال جب وہ گرتا پڑتا اس شہر میں داخل ہوا، تو شہر کے صدر بازار میں اُسے ہجوم نظر آیا، جو ایک سمت خراماں خراماں جا رہا تھا۔ اس نے ہجوم کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ یہ ہجوم ایک عالی شان محل کے صحن میں داخل ہوا۔ اس صحن میں ایک خوبصورت نوجوان بڑی شان سے تخت پر جلوہ افروز تھا۔ اس کی دائیں طرف خوب رُو غلام اور بائیں طرف حسین لونڈیاں قیمتی اور چمکیلی پوشاکیں زیب تن کیے دست بستہ کھڑی تھیں۔ نوجوان نے لوگوں کو دیکھا تو اپنی مسندِ شاہانہ سے اٹھا اور انھیں بڑی عزت سے بٹھایا۔ تباہ حال سوداگر نے جب یہ حال دیکھا، تو مارے خوف کے، کہ کہیں اُسے سخت سُست نہ کہے، چپکے سے کھسک گیا اور ایک ایسی جگہ چھپ گیا، جہاں پر کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔

اتفاق کی بات اسی جگہ پر ایک شخص چار کتے لے کر آیا۔ ان کتوں کی پُشت پر اطلس و کمخواب کے ٹکڑے اور ان کی گردنوں میں سونے کے پٹے پڑے تھے اور زنجیریں چاندی کی تھیں۔ اس شخص نے ہر کتے کو الگ الگ جگہ پر باندھا اور باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سونے کے چار طشت

لایا، جن میں مصالحے دار بُھنا ہوُا گوشت رکھا تھا۔ وہ ہر کتّے کے سامنے ایک طشت رکھ کر باہر چلا گیا۔

غریب سوداگر چھُپ کر یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ جب وہ آدمی باہر گیا تو وہ رینگتے رینگتے ایک کتّے کے قریب پہنچا۔ بھوک سے اس کا حال پتلا ہو رہا تھا۔ اور اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ کتّے کے ساتھ ہی طشت سے گوشت کھائے۔ لیکن اسے کتّے سے بھی خوف آ رہا تھا۔

اللہ کی قدرت دیکھیے کہ کتّے کو اس مفلس اور فاقہ کش سوداگر کی حالت پر رحم آ گیا۔ اور کتّے نے اسے سر کے اشارے سے اپنے پاس بُلایا۔ یہ بے چارہ ڈرتے ڈرتے طشت کی طرف بڑھا تو کتّے نے اپنی تھوتھنی ہلا کر اپنے کھانے کا اشارہ کیا اور خود پیچھے ہٹ گیا۔ سوداگر نے خوب جی بھر کر گوشت کھایا اور جب وہ اپنی جگہ پر واپس جانے لگا تو کتّے نے اپنے پنجے سے طشت بھی اس کی طرف بڑھا دیا۔ غریب آدمی نے سمجھ لیا کہ کتّے کا مطلب یہ ہے کہ وہ طشت لے جائے۔ وہ طشت کو اپنے لباس میں چھُپا کر محل سے باہر نکل گیا۔

اسی وقت اس نے وہ شہر چھوڑ دیا۔ دوسرے شہر میں جا کر اس نے طشت فروخت کیا اور حاصل کی ہوئی رقم سے کاروبار کرنے لگا۔

اللہ نے اس کی مدد کی اور تجارت میں برکت ہوئی اور وہ پھر پہلے کی طرح مال دار ہو گیا۔

اب وہ بڑا ہی نہال اپنے شہر واپس آیا۔ اس نے اپنے دستوں

اور واقف کاروں کی دعوت کی اور اپنا سابقہ قرضہ اتارا۔ اللہ کا شکر ادا کیا۔ کیونکہ وہی بُرے وقت دُور کرتا ہے۔ اس طرح ہنسی خوشی چند سال گزر گئے۔

ایک روز اُسے اچانک اس کتّے کا خیال آیا۔ جس کی بدولت وہ حقیر ذلّت سے نکل کر قابلِ احترام بن گیا تھا۔

اس نے سوچا کہ کتّے کے مالک سے ملنا چاہیے اور شکریے کے ساتھ طشت کی قیمت واپس کر دینی چاہیے۔ اس ارادے سے اس نے سفر کی تیاریاں شروع کر دیں۔ کتّے کے لیے تحائف اور اس کے مالک کے لیے بھی قیمتی اشیا خرید کر وہ روانہ ہوا۔ ایک رات اور ایک دن کی مسافت طے کر کے وہ اس شہر پہنچا۔ دیکھتا کیا ہے کہ وہ عالی شان محل ہے نہ غلام، ہجوم نہ پہرے دار۔ بلکہ ہر طرف کھنڈر ہی کھنڈر ہیں۔

قریب تھا کہ وہ افسوس کرتا ہوا واپس چلا جاتا کہ اچانک اس کی نظر ایک شخص پر پڑی جو کھنڈرات میں ایک طرف سر جھکائے بیٹھا تھا۔ جب اس نے قریب جا کر دیکھا۔ تو اس کے بدن میں کپکپی پیدا ہو گئی۔ کیونکہ وہ شخص چیتھڑوں میں ملبوس اپنی قسمت کو رو رہا تھا۔

سوداگر نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ "بندۂ خدا! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کھنڈرات پر کھڑے عالی شان محل کو کیا ہوا؟ اور اس کے مکیں کہاں گئے؟"

اس نے اپنا سر گھٹنوں سے اٹھایا اور جواب دیا۔ "اے اجنبی جسے تم اپنے سامنے ننگا اور خستہ حال دیکھ رہے ہو، یہ وہی بدقسمت اور گنہگار شخص ہے جو کچھ عرصے پہلے ان کھنڈرات پر کھڑے عالی شان محل کا مالک تھا۔

کیا تم جانتے نہیں؟ کہ ان تمام اشیا کا حقیقی مالک اللہ ہی ہے۔ وہی عزت دیتا ہے اور وہی قلاش بناتا ہے۔ آج سے کچھ مدت پہلے میں اس محل کا مالک تھا۔ میں نے ہی اسے بنایا اور میں نے ہی اسے آراستہ و پیراستہ کیا تھا ـــــ کرّو فر سے زندگی بسر کی۔ مگر وائے قسمت! یہ قسمت ہی کا چکر ہے۔ کہ دیکھتے دیکھتے ہی محل کھنڈرا اور مالک فقیر بن گیا۔ حسین لونڈیاں اور خوبصورت غلام خواب کی باتیں ہوگئیں۔ ہیرے جواہرات مٹی کے ریزے بن گئے۔ جس طرح قدرت نے مجھے سب کچھ دیا تھا اسی طرح واپس لے لیا ـــــ مگر ٹھیرو! تمھارے اس سوال کی کوئی وجہ ضرور ہے۔ تم نے محل کے متعلق دریافت کیوں کیا؟

سوداگر نے کتے اور سونے کے طشت کا تمام ماجرا کہہ سنایا۔ اور آخر میں کہا۔ "میں طشت کی قیمت اور دیگر تحائف لے کر حاضر ہوا ہوں۔"

یہ سن کر وہ تباہ حال شخص پکار اٹھا۔ "میرے خیال میں تم کچھ پاگل ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میرا ایک کتا تمھیں سونے کا طشت دے۔ بہرحال یہ بڑی عجیب بات ہے۔ خیر میں وہ چیز لینے کا مجاز نہیں رکھتا جو میرے کتے نے عطا کی ہو۔ اللہ نے مجھے جس حال میں رکھا ہے، میں اسی میں خوش ہوں۔ میں تم سے ایک کچی کوڑی بھی نہیں لوں گا۔ جہاں سے تم آئے ہو، خوشی خوشی وہاں لوٹ جاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو کہ تمھیں اس نے پھر نوازا ہے۔ اور مجھے میرے حال پر رہنے دو۔"

ایک مُفلس کا خواب

شہر بغداد میں ایک شخص رہتا تھا۔ خدا تعالیٰ نے اسے دولت و عزّت سے نوازا تھا۔ لیکن کچھ عرصے بعد وہ مفلس ہوگیا۔ وہ دل گیر اور پریشان یہی سوچتا رہتا کہ وہ اس مفلسی سے کیسے نجات حاصل کرے۔ ایک رات اس نے خواب دیکھا کہ ایک سفید ریش بزرگ صورت اس سے کہہ رہا ہے۔ اٹھو! بندۂ خدا تمھاری تقدیر قاہرہ میں تمھاری منتظر ہے۔

مفلس جب بیدار ہوا تو اسے یہ خواب قدرت کی طرف سے ایک بشارت معلوم ہوئی۔ وہ اسی دن قاہرہ روانہ ہوگیا۔ جب بہ ہزار دِقّت وہ قاہرہ پہنچا تو رات کی تاریکی میں شہر سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ مفلس ایک مسجد میں جا لیٹا۔

اب اللہ کی قدرت دیکھیے کہ اس مسجد کے ساتھ ایک مالدار شخص کا مکان تھا۔ نصف شب کے بعد چوروں کا ایک گروہ آیا اور مسجد کے راستے سے اس مکان میں اتر گیا۔ عین اس وقت مالک مکان کی آنکھ کھل گئی اور اس نے اپنے مکان میں بن بلائے مہمانوں کو دیکھ کر چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ چور بھاگ گئے۔ لیکن اسی لمحہ شہر کوتوال چند سپاہیوں کے ساتھ ادھر سے گزرا۔ جب اس نے شور سُنا تو مالک مکان سے ماجرا سُنا۔ سپاہی فوراً مکان سے ملحقہ مسجد میں داخل ہوئے۔ انھوں نے دیکھا کہ بغدادی مفلس لمبی تانے سو رہا ہے۔ شہر کوتوال نے اسے چوروں کا رفیق سمجھا اور اسے گرفتار کر کے کوتوالی لے گئے۔ پہلے اس کی خوب مرمّت کی گئی۔ اس کا بند بند ڈھیلا کر دیا گیا اور اسے کال کوٹھری میں پھینک دیا گیا۔ وہاں وہ تین دن بھوکا پیاسا پڑا تڑپتا رہا۔

چوتھے روز اسے قاضی کے حضور میں پیش کیا گیا۔ قاضی نے اس سے پوچھا کہ تم کون ہو؟

"میں بغداد سے آیا ہوں"۔ مفلس نے جواب دیا۔

"قاہرہ میں کیا کرنے آئے ہو"؟ قاضی نے پوچھا۔

اس پر مفلس نے اپنے خواب کا ماجرا کہہ سنایا۔ اور آخر میں کہنے لگا کہ میری تقدیر کال کوٹھری کی صورت میں یہاں میرا انتظار کر رہی تھی۔

قاضی شہر مفلس کا خواب سُن کر بہت ہنسا۔ اور کہنے لگا۔

"بندۂ خدا! تمھارے جیسا بے وقوف میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ جو خواب پر یقین کر کے اپنا شہر چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا۔

سنو! مجھے بھی ایک خواب تین مرتبہ آیا ہے۔ ہر بار ایک سفید بزرگ صورت شخص مجھے یہی کہتا ہے کہ اٹھ جا تیری قسمت بغداد میں انتظار کر رہی ہے۔ وہاں شہر کے ایک کونے میں چھوٹا سا مکان ہے۔ مکان کے سامنے ایک باغیچہ ہے۔ اور اس باغیچے میں ایک فوّارہ ہے۔ اس فوّارے کے نیچے بے اندازہ دولت ہے۔ جا اور فوّارے کے نیچے دفن شدہ دولت کو سنبھال۔ لیکن دیکھو! میں نے قاہرہ چھوڑنا گوارا نہیں کیا۔ اور ایک تم بے وقوف ہو۔ جو ایک بار خواب دیکھنے کے بعد بغداد سے یہاں بھاگے آئے ہو۔ بھلے آدمی خوابوں پر اعتماد نہیں کیا کرتے۔"

قاضی نے مفلس کو چند اشرفیاں دیں اور اسے باعزّت بری کر دیا۔ مفلس فوراً بغداد روانہ ہو گیا۔ قاضی نے اپنے خواب میں جس مکان کا ذکر کیا تھا۔ اسی مکان میں یہ مفلس رہتا تھا۔ چنانچہ اپنے مکان میں پہنچ کر سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ شکستہ فوّارے کو اکھاڑنا شروع کر دیا۔ اور واقعی اللہ کی مہربانی سے وہاں اسے ایک خزانہ ہاتھ لگا۔ اور اس نے باقی زندگی بڑے مزے سے گزاری۔

جارجیا

ایک سانپ اور کسان

ایک سانپ اور کسان ، دنیا کی اُن عظیم کہانیوں میں شمار ہوتی ہے ، جو دیومالا اور انفرادی قصہ گوئی کے فن کے درمیان ایک مکمل کہانی کہی جا سکتی ہے ۔

چار سو سال پہلے جارجان (جارجیا) ایک آزاد اور خود مختار مسلم ریاست تھی ۔ آج ایران کے شمال مغرب میں یہ علاقہ سویت روس میں شامل ہے ۔ جارجیا کے تمدّن پر مسلمانوں کی چھاپ موجود ہے ۔ اور اس کی تمدّنی اکائی بدستور موجود ہے ۔

سانپ ، فراست اور دانش کا نشان رہا ہے ۔ تقریباً مشرق کے تمام ممالک میں سانپ کو یہی حیثیت حاصل رہی ہے ۔ کسان ، تمدّن کی صبح کا مظہر ہے ۔ ان دونوں مثالی کرداروں سے یہ کہانی زندگی کے ایک خاص نقطہ کو بیان کرتی ہے ۔

ایک سانپ اور کسان

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک بادشاہ بڑے اطمینان و سکون سے حکومت کرتا تھا۔ اس کا ملک خوش حال اور رعایا مالا مال تھی۔ سلطنت میں چھوٹے بڑے، ملازم، آقا سبھی خوشی سے زندگی بسر کر رہے تھے۔

ایک رات بادشاہ خواب میں کیا دیکھتا ہے۔ کہ اس کی خواب گاہ کی چھت سے ایک لومڑی دُم سے بندھی ہوئی لٹک رہی ہے۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو خواب کا مطلب سمجھنے کی بہت کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ ہوا۔ صبح کو اس نے اپنے سب وزیر اور مشیر طلب کیے۔ مگر ان میں سے بھی کوئی خواب کی تعبیر بتا نہ سکا۔

بادشاہ نے اپنے ملک میں یہ اعلان کروا دیا۔ کہ جو شخص بادشاہ کے خواب کا مطلب بتائے گا۔ تو اسے زر و دولت سے مالا مال کر دیا جائے گا۔ تیسرے روز سیکڑوں

کی تعداد میں لوگ شاہی محل میں جمع ہونے لگے۔

ایک مفلس کسان محل میں جانے کے لیے گھر سے نکلا۔ راستے میں اسے ایک تنگ پہاڑی راستہ سے گزرنا تھا۔ اس راستے کے دونوں طرف بڑے بڑے پہاڑ کھڑے تھے۔ کسان نے دیکھا کہ راستے کے موڑ پر ایک سانپ اپنا پھن اٹھائے بڑے مزے میں جھوم رہا ہے۔ سانپ کی نظر جب کسان پر پڑی، تو بولا:۔

"صبح بخیر! کسان بھائی! کہاں جا رہے ہو؟"

کسان نے بادشاہ کے خواب کا قصہ سنایا۔

"کوئی بات نہیں"۔ سانپ نے جواب دیا۔ "اگر تم مجھ سے وعدہ کرو کہ بادشاہ جو تمھیں انعام دے گا۔ اس کا نصف حصہ مجھے دوگے۔ تو میں تمھیں خواب کا مطلب بتاتا ہوں۔"

کسان یہ سُن کر بڑا خوش ہوا۔ اور اس نے حلف اٹھا کر وعدہ کیا۔ کہ وہ سب انعام سانپ کے سامنے رکھے گا۔

یہ سُن کر سانپ نے کہا۔ "میں انعام کو دو برابر حصوں میں تقسیم کر دوں گا۔ ایک حصہ تمھارا اور دوسرا میرا ہوگا۔ خیر ـــ اب بادشاہ سے جا کر کہو کہ لومڑی کا مطلب یہ ہے۔ کہ تمھاری بادشاہت میں فریب، دھوکہ، غدّاری، بددیانتی اور رشوت ستانی موجود ہے"۔

کسان سانپ کا شکریہ ادا کر کے محل کی جانب روانہ ہوا۔ جب اس نے بادشاہ کو خواب کی تعبیر بتائی تو یہ تعبیر بادشاہ کے جی کو لگی۔ اور اس نے کسان کو بہت سی مال و دولت دی۔

اتنی دولت پاکر کسان کی نیت میں فتور آگیا۔ اس لیے وہ دوسرے راستے سے اپنے گھر روانہ ہوا، تاکہ سانپ کو اس کا حصّہ دینا نہ پڑے۔

کچھ مدت بعد بادشاہ نے پھر ایک اور خواب دیکھا کہ "اس کی خواب گاہ کی چھت کے درمیان دھاگے سے بندھی ہوئی ننگی تلوار لٹک رہی ہے"۔

صبح کو بیدار ہوتے ہی بادشاہ نے کسان کو بلوا بھیجا۔ اب کسان بہت پریشان ہوا۔ بہرحال اسے مجبوراً پہلے راستے سے جانا پڑا۔

جب وہ پہلی جگہ پہنچا، جہاں اس نے سانپ دیکھا تھا۔ اب وہاں سانپ کا نام و نشان نہ تھا۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد اس نے پکارا۔ "اے سانپ بھائی! ایک گھڑی کے لیے یہاں تشریف لائیے۔ مجھے آپ سے نہایت ضروری کام ہے"۔ اور جب تک اسے سانپ نظر نہ آیا وہ زور زور سے یہی چلاتا رہا۔

آخرکار اسے سانپ کی آواز آئی۔ "اب کیا چاہتے ہو۔ اب تمھیں کیا تکلیف ہے"۔

کسان نے بادشاہ کا نیا خواب سنایا۔ اور سانپ سے گڑگڑا کر مدد مانگی سانپ نے جواب دیا۔ "بادشاہ سے جاکر کہو۔ کہ ننگی تلوار کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دشمن ملک کے اندر اور ملک کے باہر تیار کھڑے ہیں۔ بادشاہ کو چاہیے۔ کہ وہ جنگ کے لیے فوراً تیاری شروع کر دے۔ اور اپنے دشمنوں پر حملہ کر دے"۔ سانپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کسان محل کی طرف روانہ بادشاہ نے اپنے خواب کی تعبیر سنی تو اس بار پھر کسان کو مالا مال کر دیا۔

اس مرتبہ کسان انعام لے کر پہلے راستے سے اپنے گھر روانہ ہوا۔ پگڈنڈی پر سانپ بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ کسان کو دیکھتے ہی سانپ بولا" لاؤ بھائی میرا حصّہ یاد ہے نا۔ تم مجھ سے وعدہ کر چکے ہو۔"

"کیسا حصّہ؟" کسان یہ کہتے ہوئے تلوار سونت کر سانپ پر پل پڑا اور سوراخ میں گھستے ہوئے سانپ کی دُم کاٹ لی اور پھر مزے مزے اپنے گھر روانہ ہوا۔

چند سال بعد بادشاہ نے پھر خواب دیکھا کہ اس کی چھت سے ایک ذبح کی ہوئی بھیڑ لٹک رہی ہے۔

صبح کو بادشاہ نے پھر کسان کو بلوایا۔ اب کسان کے اوسان خطا ہو گئے۔ اور وہ سوچنے لگا۔" اب میں کیسے بادشاہ کے پاس جا سکتا ہوں۔ دو بار تو سانپ نے مدد کی تھی۔ اب تو سانپ مجھے کچھ بتانے سے رہا۔ بلکہ مجھے دیکھ کر نفرت سے مُنہ پھیر لے گا۔ کیونکہ میں نے سانپ کی بھلائی اور نیکی کو اپنی تلوار سے زخمی کر دیا ہے۔"

تاہم کسان کو اور کوئی راستہ سوجھتا ہی نہ تھا۔ لہذا وہ پہلے ہی راستے سے روانہ ہوا۔ اور پرانی جگہ پر پہنچ کر پکارنے لگا۔

"اے سانپ بھائی! اے سانپ بھائی! پل بھر کے لیے یہاں آیئے۔ مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔"

کافی دیر تک کسان چلّاتا رہا۔ آخر سانپ اپنے بل سے باہر نکلا۔ کسان نے اپنی پریشانی بتائی۔

سانپ بولا " اگر تم بادشاہ کا عطا کردہ انعام کا نصف حصّہ مجھے دینے کا وعدہ کرو۔ تو مَیں پھر تمھیں خواب کی تعبیر بتاؤں گا۔ کسان نے کئی قسمیں کھا کر سانپ کو یقین دلایا کہ اس مرتبہ وہ ضرور اپنا وعدہ پُورا کرے گا۔

سانپ بولا۔" بھیڑ کا مطلب یہ ہے کہ اب بادشاہ کی سلطنت میں امن و امان کا دَور دَورہ ہوگا اور لوگ بھیڑوں کی مانند مسکین اور امن پسند ہوں گے۔ اور آپس میں پیار محبّت سے رہیں گے۔

کسان نے سانپ کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ اور بادشاہ کے ہاں روانہ ہوا۔ بادشاہ اس خواب کا مطلب سُن کر بہت ہی خوش ہوا۔ اور کسان کو پہلے سے زیادہ تحائف دیے۔ کسان پُرانے راستے سے گھر روانہ ہوا۔ سانپ اس کا منتظر تھا۔ کسان نے اس کے سامنے سب تحائف ڈال دیے۔

"آپ نے کمال تحمّل مزاجی سے کام لیا۔ اور جو کچھ بادشاہ مجھے پہلے دے چکا ہے۔ وہ بھی آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں"۔ کسان نے سانپ سے کہا اور پھر بڑی ہی عاجزی سے معافی مانگنے لگا۔

سانپ بولا " تمھیں افسوس کرنا چاہیے نہ پریشان ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہ تمھارا قصور نہیں تھا۔ پہلی مرتبہ جب تم یہاں آئے اس وقت تمام لوگ دھوکے باز اور جھوٹے تھے۔ ملک میں غدّاری اور فریب دہی کا دَور دَورہ تھا۔ اس لیے تم بھی دغاباز نکلے اور اپنے وعدے کے باوجود، بادشاہ سے انعام حاصل کر کے دوسرے راستے سے اپنے گھر پہنچ گئے۔ دوسری مرتبہ ہر طرف جنگ کا چرچا تھا اور لوگ آپس میں قتل و غارت گری پر آمادہ تھے۔ تو تم بھی بغیر کسی وجہ کے

مجھ سے الجھ پڑے اور میری دُم کاٹ لی۔ اب کی بار جب ہر طرف امن و امان ہو رہا ہے اور لوگ نفرت کو بھول کر پیار سے رہنے لگے ہیں، تو تم بھی تحفے لے کر میرے پاس آ گئے ہو۔ اور مجھ سے حصہ بانٹنے کے لیے تیار ہو ـــــ جاؤ خدا کی رحمت تم پر ہو۔ مجھے تمھاری دولت کی ضرورت نہیں۔"

یہ الفاظ کہہ کر سانپ اپنے سوراخ میں گم ہو گیا۔

قدیم یونان

سائیکی

قدیم یونان کی دیومالا کا مشہور عالم قصّہ ہے۔ علم تاریخ کے ماہرین، لوک کہانی کا ایک مکمل نمونہ قرار دیتے ہیں۔ سائیکی کو لازوال ادبی حیثیت دینے والا (LUCIUS APULEIUS) یونانی ادیب ہے۔ جس کی مشہور کتاب (GOCDENASS) میں اس کہانی کو بڑی چابک دستی سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ کہانی تقریباً اڑھائی ہزار سال پُرانی بتائی جاتی ہے۔ اس میں عشق حُسن، رقابت کو دیوتاؤں کے پسِ منظر میں اُبھارا گیا ہے۔ دیومالا کے دیگر قصّوں کی مانند اس میں بھی انسانی عظمت کو غیر فانی عظمت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ سائیکی اپنے محبوب کی تلاش میں دیوی بن جاتی ہے۔

یونان کی دیومالا میں سائیکی کو حُسنِ بیان اور نزاکتِ خیال کا ایک حسین منظر سمجھا جاتا ہے۔

جدید یونان

پادری کی احمق بیٹیاں

جدید یونان سے مراد زمانہ بعد از مسیح لیا جاتا ہے۔ دیومالا کے اس گہوارے میں عوامی فن یعنی لوک کہانیوں کا نیا دَور کب شروع ہوا۔ اور دُنیا کے دلگیر ممالک کی طرح یہاں عام لوک کہانی دیومالا کے اثر سے بالکل جُدا اور الگ ہوئی۔ 'پادری کی احمق بیٹیاں' لوک کہانیوں میں نادر نمونہ ہے۔ اس قسم کی کہانیاں تقریباً ہر ملک میں ملتی ہیں۔ حماقت کے موضوع پر ہر زمانہ اور ہر دَور میں لوگوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ اس موضوع پر یہ کہانی 'نمائندہ کہانی' کہی جاسکتی ہے۔

سائیکی

ایک بادشاہ کی تین بیٹیاں اپنے حُسن کی بنا پر دُور و نزدیک مشہور تھیں۔ سب سے زیادہ حسین سب سے چھوٹی بہن سائیکی تھی۔ جب سائیکی مندر میں جاتی تو اس کے حُسن کو دیکھ کر اکثر لوگ اس پر دیوی وینس کا دھوکا کھا جاتے تھے۔ اور پھولوں کے وہ گجرے جو حُسن و محبّت کی دیوی پر چڑھانے لائے ہوتے سائیکی کو پیش کر دیتے تھے۔

دیوی وینس یہ دیکھ کر بڑی غضب ناک ہوئی اور اس نے ارادہ کر لیا کہ سائیکی سے انتقام لے گی۔ حالانکہ اس بے چاری کا کوئی قصور نہ تھا۔ ایک روز وینس نے عشق کے دیوتا ایروز (کیوپڈ) سے کہا کہ وہ اپنے سنہری تیر سے سائیکی کے دل کو زخمی کر دے اور اسے کسی ایسے بدنصیب بھکاری کی محبّت میں گرفتار

کردے، جو انتہائی ذلیل ہو چکا ہو۔

ایروز نے اپنا تیر کمان سنبھالا اور اپنی ماں (وینس) کا فرمان پورا کرنے کی نیت سے زمین پر اترا۔ جب اس کی نظر سائیکی پر پڑی تو وہ اس کے حسن لازوال سے مبہوت ہو گیا اور محویت کے عالم میں اس نے اپنے ہی تیر سے اپنے آپ کو زخمی کر لیا۔ چنانچہ وہ جو سائیکی کو کسی چیتھڑے لٹکائے بھکاری کی محبت میں گرفتار کرانے آیا تھا۔ خود اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔

سائیکی کی دونوں بڑی بہنوں کی شادی شاہی خاندان میں ہو چکی تھی۔ لیکن سائیکی کے حسن جہاں سوز کے باوجود اس کے لیے کوئی منگیتر نہ آیا۔ بادشاہ کو یہ شک ہوا کہ کہیں سائیکی کی شادی نہ ہونے کی وجہ، دیوی وینس کی ناراضگی نہ ہو۔ چنانچہ اس نے مندر کی الہامی طاقت سے دریافت کیا کہ وہ اس بارے میں کیا کرے۔ اور جو جواب اسے ملا اس سے دیوتاؤں کی ناراضگی میں کوئی شبہ نہ رہا۔ دیوتاؤں کا پیغام سنانے والی راہبہ کے یہ الفاظ تھے :۔

اپنی بیٹی کو دلہن کی مانند آراستہ کر۔ اور اسے پہاڑ کی چٹان پر لے جاؤ یہاں ایک نامعلوم پروں والا دشمن ہے جس سے بستی میں رہنے والے ڈرتے ہیں۔ بلکہ جس سے بلندی کے دیوتا بھی خوف زدہ ہیں۔ اسے یوں دبوچ لے گا جیسے باز فاختہ کو قابو میں کر لیتا ہے۔

بادشاہ غم سے نڈھال ہو گیا۔ لیکن وہ آفاقی حکم عدولی کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ ایک رات سائیکی کی خادمہ نے اسے شادی کا لباس پہنایا۔ بادشاہ اس کے مصاحب اور درباریوں کا ایک جلوس سائیکی کو چھوڑنے پہاڑ کی چوٹی

تک گئے۔ جہاں انھوں نے بڑے افسوس سے اپنی مشعلیں گُل کردیں اور سائیکی کو تاریکی میں چھوڑ کر واپس آ گئے۔

جب ان کے پاؤں کی چاپ ختم ہو گئی۔ تو سائیکی خوف کے مارے کانپنے اور رونے لگی۔ اسے خیال تھا کہ ابھی وہ افعی کے پیروں کی پھڑپھڑاہٹ سنے گی۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ جیسے تیز پنجے اور خونخوار دانت اس کے جسم میں پیوست ہو رہے ہیں۔ لیکن عین اس وقت ٹھنڈی ہوا کا ایک خوش گوار جھونکا آیا۔ اور اس نے دیوتا ریفرس کے پیروں کو محسوس کیا۔ جس نے آہستہ آہستہ چٹان سے اٹھایا اور دوسری طرف سرسبز وادی میں لے اُڑا۔ اور پھر پیاسیں کے کنارے پر اسے لٹا دیا۔

چاندنی میں وادی بڑی پیاری اور پُرسکون معلوم ہوتی تھی۔ سائیکی کا خوف جاتا رہا اور اسے نیند نے آ لیا۔ صبح کو جب وہ بیدار ہوئی تو اس نے اپنے چاروں طرف بلند قامت درختوں کا مرغزار دیکھا اور اس مرغزار کے وسط میں انتہائی شاندار اور نفیس محل تھا۔ محل کے سامنے ایک چشمہ بہہ رہا تھا چھت کے بلند بالا محرابوں کو سنہری ستونوں نے سہارا دے رکھا تھا۔ دیواروں پر چاندی سے پچی کاری کی ہوئی تھی۔ اور فرش ہفت رنگ کے پتھروں سے مزین تھا۔

سائیکی جھجکتے ہوئے محل کے دروازے میں داخل ہوئی اور وسیع دالانوں میں گھومنے لگی۔ ہر دالان پہلے سے کچھ زیادہ ہی شاندار معلوم ہوتا تھا۔ اسے محل میں کوئی ذی روح نظر نہ آیا۔ لیکن ایک یا دو بار اسے محسوس ہوا کہ اس نے اپنے قریب کسی کو سرگوشی کرتے سُنا۔ جیسے کہ پریاں آپس میں گفتگو کر رہی ہوں۔ شاید

وہ چشمے میں پانی گرنے کی آواز تھی۔

اس نے ایک دروازہ کھولا۔ میز پر صرف ایک آدمی کے لیے کھانا چنا ہوا تھا سائیکی ڈرتے ڈرتے کرسی پر بیٹھ گئی اور محل کی پریاں یا کوئی غیر مرئی مخلوق، جن کی وہ سرگوشیاں سُن چکی تھی اس کی خدمت کے لیے کھڑی تھیں۔ لیکن سائیکی انھیں دیکھ نہیں سکتی تھی۔ اس نے بڑا لذیذ کھانا کھایا۔ اور جب آخری طشتری نادیدہ ہاتھوں نے اٹھالی۔ تو طاؤس خود بخود بجنے لگا۔ موسیقی شروع ہوئی۔ اور ایک مسحور کرنے والی لے پر کئی آوازیں گانے لگیں۔

شام کو تاریکی پھیلنے لگی تو سائیکی خوف سے کانپنے لگی۔ اسے یقین تھا کہ اس محل کا مالک اُڑنے والا افعی ہے اور وہ شادی کی غرض سے آئے گا۔ کسی دروازے پر زنجیر یا تالا نہ تھا۔ ہر دروازہ اور کھڑکی یوں کھلی تھی کہ جیسے دنیا میں کبھی کوئی چور یا بد رُوح پیدا ہی نہ ہوئی ہو۔

جب گہری تاریکی چھا گئی۔ اتنی گہری تاریکی کہ وہ اپنا ہاتھ بھی نہ دیکھ سکتی تھی۔ تو سائیکی نے بڑے بڑے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سُنی اور پھر ہال میں کسی کے تیز مگر ہلکے قدموں کی آواز سنائی دی۔ یہ قدم سائیکی کے قریب آکر رُک گئے اور بڑی میٹھی آواز میں بولا:-

"حسین سائیکی! یہ محل اور اس میں سب کچھ تمھارا ہے۔ اگر تم میری بیوی بننے پر رضامند ہو جاؤ۔ اور یہاں مستقل طور پر رہائش اختیار کر لو۔ جن آوازوں کو تم سُن رہی ہو۔ وہ آوازیں تمھاری کنیزوں کی ہیں۔ جو تمھارا ہر حکم بجا لائیں گی۔ ہر رات میں تمھارے پاس بسر کروں گا۔ لیکن

دن کی روشنی سے پہلے مَیں یہاں سے پرواز کر جاؤں گا۔ میرا چہرہ دیکھنے کے لیے مجھ سے کبھی بھی نہ کہنا، اور نہ یہ جاننے کی کوشش کرنا کہ مَیں کون ہوں۔ صرف مجھ پر اعتماد رکھو۔ مَیں اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔''

اس آواز سے سائیکی کا خوف کافی حد تک دُور ہوگیا۔ لیکن اب بھی شک تھا۔ کہ یہ آواز افعی کی تھی۔ ہر رات اس کا یہ پُراسرار محبوب اس سے گفتگو کرنے آتا۔ بعض اوقات تو سائیکی اس کی آمد کا خوشی سے انتظار کرتی۔ لیکن کئی بار اس کے پروں کی آواز سائیکی کو خوف سے لرزا دیتی تھی۔

ایک روز محل کے باہر وہ گلاب کے پھُول چُن رہی تھی۔ اور اسے پہاڑ کی وہ چٹان نظر آرہی تھی، جہاں سے ریفرس اسے اٹھالایا تھا۔ سائیکی نے غور سے دیکھا تو اس چٹان پر کھڑی اس کی دونوں بہنیں رو رہی ہیں اور اپنی چھاتیاں پیٹ رہی اور بلند آواز میں بین کر رہی ہیں۔ سائیکی کو خیال گزرا کہ وہ اس کی موت پر رو رہی ہیں اور انھیں یقین ہو چکا ہے کہ مجھے افعی نے کھا لیا ہے۔ درحالانکہ بہنیں اس سے بہتر سلوک نہ کرتی تھیں۔ لیکن اب انھیں یوں بین کرتے دیکھ کر سائیکی نے سمجھا کہ درحقیقت وہ اس سے بے پناہ محبت کرتی تھیں۔

اس رات جب سائیکی کا محبوب آیا، تو سائیکی نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ اپنی بہنوں سے ملاقات نہیں کر سکتی۔ تاکہ انھیں بتائے کہ وہ زندہ اور خوش وخرم ہے۔ اس کا جواب اسے بددلی سے اثبات میں ملا۔

دوسرے روز اس کی بہنیں پھر چٹان پر آئیں۔ تو جس طرح سائیکی کو ریفرس اٹھالایا تھا۔ اسی طرح وہ انھیں بھی وادی میں لے آیا۔ اپنی چھوٹی

بہن کی خوش نصیبی کو دیکھ کر وہ جل گئیں۔ انھوں نے سائیکی سے کئی سوالات کیے اور خاص طور پر محل کے مالک کے بارے میں معلوم کرنا چاہتی تھیں کہ وہ کون ہیں۔ سائیکی نے انھیں جواب دیا کہ وہ پہاڑی پر شکار کھیلنے گیا ہے۔ ریفرس نے جب یہ دیکھا کہ وہ سب کچھ دریافت کرنے کے درپے ہیں تو اس نے انھیں پھر چٹان پر پہنچا دیا اور اس طرح بہنوں کی پہلی ملاقات ختم ہوگئی۔

کچھ مدّت کے بعد سائیکی تنہائی سے اکتا گئی اور اپنی بہنوں سے ملاقات کی خواہش ظاہر کرنے لگی۔ اس کے محبوب نے اس مرتبہ پھر اجازت دے دی۔ لیکن ساتھ ہی اسے متنبہ کر دیا کہ وہ اس کے متعلق کسی سوال کا جواب نہ دے۔ بلکہ اس قسم کے سوال کو سنے ہی نہ۔ اس کے علاوہ اس نے سائیکی کو بتایا کہ اگر سائیکی نے اس کے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کی۔ تو وہ اسے مجبوراً چھوڑ کر یہاں سے پرواز کر جائے گا اور یہ محل بھی غائب ہو جائے گا۔

دوسرے روز ریفرس اس کی بہنوں کو پھر وادی میں لے آیا۔ یہ کینہ پرور عورتیں اپنی بہن کے اعلےٰ نصیبے پر جلتی رہتی تھیں۔ حتیٰ کہ ان کے دل بدی سے پُر ہو گئے۔ انھوں نے ایک ایسی حرکت سوچی کہ جس سے سائیکی کی خوشی برباد ہو جائے۔ اس بار ملتے ہی انھوں نے سائیکی کو یقین دلایا کہ اس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ اس محل کا مالک اُڑنے والا اژدہا ہے۔ راہبہ کے بیان کے مطابق اس اژدہے کا کوئی نام نہیں۔ جو لوگ پہاڑ پر رہتے ہیں انھوں نے اسے کئی بار شام کو اس وادی میں اُترتے دیکھا ہے۔ بہ ظاہر وہ بڑا رحم دل معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے اسے مزید بتایا۔

اژدہا اسے صرف نگلنے کے انتظار میں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تم اس کی بکروہ شکل سے ڈر جاؤ گی۔ اس لیے وہ تمھیں اجازت نہیں دیتا کہ تم اسے دیکھ سکو۔ تم اپنی بہنوں کا مشورہ قبول کرو جو تجربے اور عمر میں تم سے بڑی ہیں۔ یہ خنجر لو اور جب تمھارا نام نہاد عاشق تم سے گفتگو کرنے کے بعد سو جائے تو چراغ جلا کر اسے دیکھو۔ اگر ہمارے الفاظ حقیقت پر مبنی ہوں۔ تو اس خنجر سے اس کا سر قلم کر دو۔ اور اپنے آپ کو اذیت ناک موت سے بچا لو"۔ یہ کہہ کر اور سائیکی کو خنجر دے کر وہ وہاں سے چل دیں۔

سائیکی کے دل میں اس کی بہنوں کے الفاظ سے ایسا خوف بیٹھا کہ وہ اسے دُور کرنے میں ناکام رہی۔ اور اس کا اپنے محبوب سے اعتماد بھی اٹھ گیا۔ وہ سوچنے لگی۔ کہ اگر اس کے نادیدہ عاشق کے الفاظ سچّے ہیں تو وہ خود کو تاریکی میں چھپانے پر اتنا مصر کیوں رہتا ہے۔ یا وہ میری بہنوں کی ملاقات کو اچھا کیوں نہیں سمجھتا؟ اس کے پر کیوں ہیں؟ اسے کپکپی سے بھی یاد آیا کہ اس نے دو ایک بار فرش پر سانپ کے رینگنے کی آواز سنی تھی۔

جلد ہی تاریکی چھا گئی اور اس نے اپنے محبوب کی آمد محسوس کی۔ لیکن آج سائیکی نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ اس لیے وہ چُپ چاپ دوسرے کمرے میں جا کر ایک مسہری پر سو گیا۔

تھوڑی دیر بعد سائیکی اٹھی اور چراغ روشن کیا۔ ایک ہاتھ میں خنجر اور دوسرے میں چراغ لے کر اس کی مسہری کی طرف بڑھی۔ جب روشنی اس کے چہرے پر پڑی تو سائیکی کو کوئی سانپ تو نظر نہ آیا۔ بلکہ ایروز یعنی بذاتِ خود

عشق کو مسہری پر لیٹے دیکھا۔ تمام دیوتاؤں سے حسین دیوتا میٹھی نیند سو رہا تھا۔ اس کے منور چہرے پر سنہری گھنگھریالے بال بکھرے ہوئے تھے اور تتلی کے پروں سے زیادہ نازک اور برف سے زیادہ سفید پر اس کے پہلو میں پڑے تھے۔ اس کے سانس کی آمد و رفت سے پروں کے کنارے متحرک تھے۔ اس کے پاؤں میں سنہری تیر کمان پڑے تھے۔

سائیکی نے اپنے خوفناک ارادے سے کانپتے ہوئے خنجر پھینک دیا۔

سائیکی نے سنہری تیر کے سرے پر اپنی انگلی پھیری تو اس کی انگلی زخمی ہو گئی اور چراغ کو بلند کر کے ایروز کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اور پہلی بار عشق کو عشق کے دیوتا سے محبّت ہو گئی۔ سائیکی بے پایاں مسرّت کے شدید احساس سے اسے دیکھنے لگی۔ لیکن اس کا ہاتھ کانپ گیا اور چراغ سے گرم تیل کا ایک قطرہ دیوتا کے کندھے پر گر پڑا۔ ایروز کی آنکھیں کھل گئیں اور سائیکی پر غضب ناک نگاہوں سے دیکھتا ہوا، چپ چاپ وہاں سے پرواز کر گیا۔ دوسرے لمحے وہ خوبصورت محل غائب ہو گیا اور اتھاہ تاریکی میں سائیکی یکا و تنہا رہ گئی۔

مدّت تک سائیکی اپنے کھوئے ہوئے محبوب کی تلاش میں سرگرداں رہی۔ وہ دیوتا پے ن، دیوی سیریز اور جونو سے ملی۔ لیکن کوئی بھی اس کی مدد نہ کر سکا یہ سوچتے ہوئے وہ دیوی وینس سے ملی کہ شاید ایروز کی ماں اپنی محبّت کی خاطر ہی اس پر رحم کر دے۔

اس دوران میں دیوتا ایروز اپنی ماں، دیوی وینس کے محل میں صاحبِ فراش

تھا۔ اُسے تیل کے زخم سے کافی تکلیف تھی۔ وینس کو تمام واقعات ایک چڑیا نے بتلائے تھے، جو وادی سے گئی تھی۔ دیوی وینس بڑی ناراض تھی اور سزا کے طور پر سائیکی کو ایسے کام سوچنے لگی جو ناممکنات میں سے تھے۔

سب سے پہلے دیوی نے سائیکی کو ننھے ننھے بیجوں کا بہت بڑا انبار دیا۔ یہ بیج اس کی رتھ کو کھینچنے والی خاص فاختاؤں اور ان چڑیوں کی خوراک تھے جو سفر میں اس کے ہمراہ رہتی تھیں۔ یہ انبار گندم، جَو، چنے اور دیگر کئی قسم کے بیجوں پر مشتمل تھا۔

"اس انبار سے ہر جنس کا بیج جدا کر کے ان کی ڈھیریاں بنا دو۔ یہ کام شام سے پہلے ختم ہونا چاہیے۔" وینس نے حکم دیا۔ بے چاری سائیکی کو تو یہ حوصلہ ہی نہ ہوا کہ وہ انبار کو ہاتھ لگائے۔ وہ مایوسی اور ناامیدی میں سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اتنے میں پتھر سے ایک چیونٹی نکلی اور وہ محبت کی خاطر چیونٹیوں کی ایک فوج لے آئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے چیونٹیوں نے بیجوں کے انبار کو علیحدہ علیحدہ جنسوں کے ڈھیر میں بدل دیا۔

جب شام کو وینس آئی اور دیکھا کہ سائیکی اپنا کام ختم کر چکی ہے، تو وہ بڑی حیران ہوئی اور بے چاری کی طرف باسی روٹی کا ایک ٹکڑا پھینکتے ہوئے کہا۔

"سائیکی! صبح اس سے بھی مشکل کام کے لیے تیار رہو۔"

صبح وینس، سائیکی کو دریا کے کنارے لے گئی اور دوسرے کنارے پر ایک مرغزار کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں سنہری اُون والی بھیڑوں کا ایک گلہ چر رہا تھا۔

"وہاں سے تھوڑی سی سنہری اُون مجھے لا دو۔" وینس نے حکم دیا۔

سائیکی اسی وقت دریا میں کود گئی ہوتی اگر کنارے کے سرکنڈے سرگوشی میں یہ نہ بتلاتے۔ "ان بھیڑوں کے پاس اب مت جاؤ، کیونکہ جب سورج بلند ہو تو وہ بڑی خونخوار ہوتی ہیں۔ ابھی انتظار کرو۔ جب بہتے دریا کا ترنّم انھیں میٹھی نیند سُلا دے گا تو پھر تم جھاڑیوں میں لٹکتے ہوئے اُون کے گچھے لا سکتی ہو جنھیں بھیڑیں چھوڑ آتی ہیں۔

سائیکی سورج ڈھلنے تک کنارے پر منتظر رہی اور پھر دریا کو عبور کر کے سنہری اُون کے کئی گچھے لے آئی۔

جب وینس نے سائیکی کو بخیریت واپس آتے دیکھا۔ تو وہ زیادہ بگڑتے ہوئے کہنے لگی "یہ اُون تم خود نہیں لائی ہو۔ خیر! اب میں دیکھوں گی کہ تم کتنی ذہین اور ہوشیار ہو۔ اور ایروز کی دلہن بننے کے قابل بھی ہو یا نہیں۔ شیشے کا یہ مرتبان لو اور اسے چشمۂ فراموشی سے بھر لاؤ۔"

یہ چشمہ بہت بلند پہاڑ کی سب سے بڑی چوٹی پر واقع تھا اور اس کا یخ پانی ایک سیدھی چٹان سے بڑے زور سے نیچے گرتا تھا۔ یہ چشمہ اتنی بلندی پر تھا کہ کوئی انسان وہاں پہنچ ہی نہیں سکتا تھا۔ چشمے کا پانی نیچے نشیب میں ایک ندی کی صورت میں بہتا اور چیختا تھا کہ مجھ سے دُور بھاگو! ورنہ تم تباہ ہو جاؤ گے۔"

اس سیاہ ندی کے دونوں اطراف ایک مہیب غار تھی جس میں خونناک اژدھے رہتے تھے۔ جب سائیکی اس جگہ پر پہنچی تو خوف سے اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ ہل جُل سکتی تھی نہ بول سکتی تھی۔ تاہم اس کا یہ کام بھی پُورا ہُوا۔ جیوپیٹر کا شاہین جس سے ایروز مہربانی سے پیش آتا تھا۔ اس نے سائیکی

سے مرتبان لیا اور چشمے سے بھر کر اسے دے دیا۔

سائکی پانی حاصل کر کے اس اُمید پر وینس کے پاس پہنچی کہ اب وہ مہربان ہو جائے گی۔ لیکن وینس پانی کو دیکھ کر اور غضب ناک ہوئی اور کہنے لگی۔

"تم ساحرہ ہو! یا یہ کام تم نے خود نہیں کیے۔ بہر کیف ایک کام اور ہے۔ یہ ڈبیہ لو اور زمین دوز دنیا میں جاؤ اور پروسرپینا (زمین دوز دنیا کی ملکہ) سے میرے لیے تھوڑا سا حسن مانگ لاؤ۔"

اب سائکی کو یقین ہو گیا کہ وینس اسے موت کے گھاٹ اتارنا چاہتی ہے اور دیوی کے فیصلے کے خلاف جدّوجہد کرنا بے سود ہے اور وہ اپنی زندگی کو ختم کرنے کی غرض سے ایک بلند مینار پر چڑھنے لگی۔ لیکن مینار کے پتھر اس سے مخاطب ہوئے۔

"سنو! سائکی وہ زمین ہر کانٹوں سے بھری ہوئی ایک دراڑ ہے۔ وہاں سے زمین دوز دنیا کو راستہ جاتا ہے۔ جَو کی روٹی کے دو ٹکڑے اپنے دونوں ہاتھوں میں لو اور دو سکّے اپنے مُنہ میں رکھو اور اس خستہ اور خوفناک راستے پر چلتی جاؤ۔ اور جب تم لاشوں کے دریا پر پہنچو گی۔ تو چارون ایک سکّہ لے کر تمھیں دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچا دے گا۔ اور جب تم پلوٹو (زمین دوز دُنیا کا دیوتا) کے محل کے دروازے پر پہنچو گی تو وہاں سربیرس پہرے پر ہوگا۔ اس خوف ناک کتے کو ایک روٹی کا ٹکڑا دے دو۔ وہ تمھیں دروازے سے گزرنے دے گا۔ جب محل میں داخل ہوگی تو پروسرپینا ملکہ اپنے حُسن کا ذرا سا حصّہ ڈبیا میں بند کر دے گی۔ ڈبیا لے کر اس راستے سے واپس چلی آنا۔ روٹی کا دوسرا ٹکڑا

سر بیرس کو اور دوسرا سکّہ چارون کو دے دو ۔ ایک بات اور ـــــــ ہم تمھیں متنبہ کرتے ہیں کہ کسی حالت میں بھی اس ڈبیا کو نہ کھولنا ۔"

سائیکی اس مشورے کی بڑی شکر گزار ہوئی اور اس نے سوائے ایک بات کے اس پر پورا پورا عمل کیا ۔ جب وہ واپس لوٹ رہی تھی تو ڈبیا کو نہ کھولنے کی تنبیہ کو بھول گئی ۔ چونکہ عشق اس سے پرواز کر چکا تھا اور اس کی تلاش میں اتنی تکالیف برداشت کر چکی تھی کہ وہ تقریباً اپنا حسن کھو بیٹھی تھی ۔ لہذا یہ سوچتے ہوئے کہ پروسرپینا کے عطا کردہ حسن سے اگر وہ خود ذرہ بھر حسن لے لے تو اس میں کوئی قباحت نہ ہوگی ۔ اس نے ڈبیا کا ڈھکنا کھولا اور شوں ـــــــ اس سے عجیب نادیدہ چیز نکلی ۔ اور دوسرے لمحہ سائیکی گہری نیند سو گئی ۔ اور شاید وہ کبھی بھی بیدار نہ ہوتی ۔ اگر ایروز کا گزر اس طرف نہ ہوتا ۔ جس کا زخم مندمل ہو چکا تھا ۔ اس کی نظر سائیکی پر پڑی اور اس نے جھنجھوڑ کر اسے بیدار کیا اور اسے ڈبیا دے کر اپنی ماں وینس کے پاس روانہ کر دیا اور خود کوہ اولمپس کی طرف پرواز کر گیا ۔ اور سب واقعات جوپیٹر کے گوش گزار کیے ۔ دیوتاؤں کے بادشاہ نے جب یہ کہانی سنی ۔ تو اس نے کہا کہ سائیکی کو غیر فانی ہونا چاہیے اور اس کے بعد اسے ایروز کی دلہن بنا دیا جائے ۔

سائیکی کو اولمپس پر لانے کے لیے دیوتا مرکری کو فوراً روانہ کیا گیا ۔ اور تمام دیوتاؤں کو دعوت دی گئی ۔ جوپیٹر نے اپنے ہاتھ سے اس فانی لڑکی کو مقدس آبِ حیات کا جام دیا ۔ اسے پی کر فانی انسان غیر فانی ہو جاتا ہے ۔ جب سائیکی نے سونے کے جام کو منہ سے لگایا ، تو یک لخت اس کے شانوں

سے دو خوبصورت تتلی کی مانند پَر نکل آئے اور وہ دیوی بن گئی۔

سائیکی اور دیوتا ایروز کی بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی اور سائیکی ایروز سے کبھی جُدا نہ ہوئی۔ شادی پر دیوتا اپالو نے گیت سنائے۔ وینس کی ناراضگی دُور ہو چکی تھی۔ اور اس نے اپنا رقص دکھایا ——

پادری کی احمق بیٹیاں

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک پادری کی تین بیٹیاں تھیں۔ لیکن پہلے مجھے یہ نہ بتانا چاہیے کہ یہ اپنی ماں سمیت حماقت میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔ ایک روز چرچ میں عبادت کے بعد بڑی بیٹی جو خاندان کی ناک سمجھی جاتی تھی۔ وہ چہل قدمی کرتی ہوئی پاس کی پہاڑی پر نکل گئی۔ اور سوچنے لگی۔

"ایک روز میری شادی ہوگی اور پھر میرا ایک ننھا بچہ ہوگا اور وہ یہاں پہاڑی پر آئے گا۔ وہ نیچے جھانکے گا تو گر پڑے گا اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ ہائے میرے بچے۔ میرے لعل —— اور اس نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ پہاڑی کے نیچے اس کی بہنیں اور ماں منتظر تھیں۔ جب کافی دیر ہوگئی۔ تو ان میں سے ایک بولی "آخر ہماری بہن کو کیا ہوگیا ہے

منجھلی بہن بڑی کو دیکھنے چوٹی پر گئی۔ اس نے بڑی بہن کو چٹان پر زاروقطار روتے دیکھا۔

" پیاری بہن کیا بات ہے کیوں رو رہی ہو"؟ اس نے پوچھا۔

" افسوس"، بڑی بہن نے جواب دیا "کیا تم یہ چٹان نہیں دیکھ رہی۔ جب میری شادی ہو گی اور پھر تمھارا ننّھا بھائی ہو گا تو وہ اس چٹان پر آئے گا اور نیچے گر کر مر جائے گا۔"

یہ سن کر منجھلی بہن بھی رونے لگی۔ تکرار برطرف، چھوٹی بہن اور ان کی ماں دیکھنے گئیں اور وہ بھی رونے اور واویلا مچانے لگیں۔

جب معزز پادری انتظار کرتے کرتے تنگ آگیا تو اس نے بھی پہاڑی کا رُخ کیا اور اس نے ماں اور بیٹیوں کو یوں روتے اور بین کرتے ہوئے پایا تو حیرانگی سے پوچھنے لگا۔

" خیر تو ہے، یہاں بیٹھی رو کیوں رہی ہو"؟

اسے جواب ملا کہ "بڑی لڑکی کی شادی ہو گی۔ پھر ننّھا پیدا ہو گا۔ اور وہ اس چٹان سے نیچے گر کر جان دے دے گا۔"

" خدا میرے حال پر رحم کرے"۔ پادری نے کہا " اور تمھاری قسمت پھوٹے۔ کب تک میں تمھاری حماقتوں کو برداشت کرتا رہوں گا۔ تمھیں تو عقل آنے سے رہی۔ میں خدا کو حاضر ناظر کر کے کہتا ہوں کہ میں یہاں سے بھاگ جاؤں گا۔ تمھیں تمھارے حال پر چھوڑتا ہوں۔ ورنہ تم میری تباہی کا سبب بنو گی۔"

پادری نے گھر آکر اپنا بوریا بستر باندھا اور یہ کہتے ہوئے سفر پر روانہ ہو گیا۔

"اے بد قسمت عورتو! اگر قسمت نے یاوری کی اور میں تم سے زیادہ احمق دیکھ سکا تو ممکن ہے کہ میں واپس آجاؤں۔ ورنہ تمھاری آنکھیں پتھرا جائیں گی۔ لیکن تم مجھے پھر نہ دیکھ سکو گی"۔

کافی مسافت طے کر کے پادری ایک گاؤں میں داخل ہوا۔ اس نے ایک گھر سے رونے کی آواز سُنی۔ آگے بڑھ کر جھانکا، تو دیکھتا ہے کہ ایک عورت پنگوڑے کے سامنے بیٹھی ہے۔ پنگوڑے میں ایک بچّہ لیٹا ہے اور عین پنگوڑے کے اوپر ایک ٹلکوا لٹک رہا ہے اور عورت بین کر رہی ہے۔

"ہائے میرا بچّہ ٹلکوے سے مارا جائے گا۔"

"نیک بخت عورت! کیوں رو رہی ہو"۔ پادری نے پوچھا۔

"پادری صاحب! کیا آپ دیکھ نہیں رہے کہ ٹلکوا پنگوڑے پر گر پڑے گا۔ اور میرا بچّہ ہلاک ہو جائے گا۔ اور آپ پوچھ رہے ہیں کہ میں رو کیوں رہی ہوں"۔

"آہ۔ تو صرف میں ہی اکیلا نہیں"۔ پادری نے اپنے دل میں کہا۔ اور پھر بلند آواز میں بولا۔ "اگر میں تمھارے بچّے کو موت سے بچا لوں تو مجھے کیا دو گی؟"

"معزز پادری جو آپ مانگیے۔ اگر دینے کا مجھے اختیار ہو۔ تو میں اپنی جان تک دے سکتی ہوں"۔

پادری نے پنگوڑے کو کوٹھری کے دوسرے کونے میں رکھ دیا۔

"لو بھلی عورت! اب آنسو مت بہاؤ۔ تمہارا بچہ یہاں اب محفوظ ہے۔"

پادری عورت سے کافی معاوضہ لے کر وہاں سے چل دیا۔ ابھی وہ تھوڑی دُور ہی پہنچا تھا کہ اسے لوگوں کا ایک ہجوم نظر آیا۔ اس ہجوم سے شوروغوغا بلند ہو رہا تھا۔ پادری نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ ایک طویل قامت دُولھا مکان کے پست دروازے میں داخل نہیں ہو رہا۔ اور لوگ داخلے میں بڑی سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں کہ اس کا سر کاٹ دیا جائے یا اس کی ٹانگیں۔ دونوں تجاویز اس کے سامنے تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر پادری کا بے اختیار قہقہہ نکل گیا۔ اور پھر ان سے مخاطب ہوا۔

"میرے ہم مذہب بھائیو! آپ کو کیا تکلیف ہے اور آپ رو کیوں رہے ہیں؟"

مجمع میں سے کئی آدمیوں نے سب ماجرا سُنایا۔

"اگر دولھا کو مکان کے دروازے میں صحیح سلامت داخل کر دوں تو آپ مجھے کیا دیں گے؟" پادری نے سوال کیا۔

"ہم پر یہ مہربانی کر دیجیے۔ آپ جو مانگیں گے وہ ہم دیں گے۔"

پھر پادری نے دُولھا کا سر دونوں ہاتھوں میں تھاما۔ اور اس سے بڑی نرمی سے کہنے لگا

"ذرا جُھکو ——— بیٹے ذرا سا اور جُھکو۔" یہ کہتا ہوا دُولھا دروازے کے اندر لے گیا۔ جب وہ اندر پہنچے تو پادری نے کہا۔

"لواب اپنا سر اُوپر اٹھاؤ اور آئندہ جب بھی تمھیں اندر یا باہر آنا جانا ہو تو یوں ہی کرنا سمجھے!"

اس کے بعد پادری نے اس کی شادی کی رسوم بھی ادا کیں اور اچھا خاصا معاوضہ لے کر آگے بڑھا۔

کچھ دُور جا کر اس نے دیکھا کہ ایک ضعیفہ ایک سُورنی کو نہلا دُھلا کر اسے زیورات سے آراستہ کر رہی ہے اور اسے اپنی بیٹی کہہ کر پکارتی ہے۔

اس ضعیفہ کی نظر پادری پر پڑی۔ تو وہ چلائی۔ "میرے بیٹے! مہربانی کر کے میری بیٹی کو شادی کے لیے لے جاؤ۔ تم دیکھ رہے ہو کہ میں بوڑھی ہوں۔ خود جا نہیں سکتی۔ میں اس تکلیف کے لیے تمھیں معاوضہ بھی دوں گی۔"

آپ کا حکم بجا لانے میں میں اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت سمجھوں گا۔" پادری نے کہا۔ اسے اپنا فائدہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے سُورنی کی رسّی تھام لی اور اسے ہانک کر لے جانے لگا۔ جب وہ چند قدم ہی گیا تھا کہ وہ بڑھیا کچھ پریشان معلوم ہونے لگی۔ اور اس نے پادری کو پھر آواز دی۔

"میرے بیٹے! ذرا میری طرف مڑو۔ مجھے اپنا چہرہ غور سے دیکھنے دو تاکہ پھر تمھیں پہچان سکوں۔"

لیکن پادری صاحب نے اس پر کوئی توجہ نہ دی اور پیچھے ایک نظر ڈالے بغیر چلتا گیا۔

"شکریہ شکریہ" وہ بوڑھی عورت بولی۔ "واہ تمھارا کتنا خوبصورت اور گول چہرہ ہے اور کیسے تیکھے نقش ہیں۔ ہاں اب بھی میں تمھیں پہچان سکتی

ہوں۔ لیکن مہربانی کر کے شادی کی دعوت سے میرے لیے کیک کا ایک ٹکڑا ضرور لیتے آنا۔"

جب پادری پہلا موڑ مڑا تو اس نے سورنی کے تمام زیورات اتار لیے۔ اور اس طرح اسے ایک خزانہ ہاتھ لگا۔ اور وہ اپنے گھر واپس لوٹ آیا۔

"خوش آمدید۔ خوش آمدید ابّا ——" اس کا تمام خاندان چلّایا۔ آپ اتنی مدّت کہاں رہے۔ آپ کی صورت دیکھنے کے لیے آنکھیں ترس گئی تھیں۔

"میرا خیال تھا کہ تم جیسا دُنیا میں اور کوئی نہیں۔ لیکن مَیں نے دیکھا کہ کئی تو حماقت میں تم سے بازی لے گئے ہیں۔ اس لیے اب میں تمھارے ساتھ ہی زندگی بسر کروں گا۔ خواہ اس کا انجام کچھ ہی کیوں نہ ہو۔"

اپنے سفر سے وہ جو دولت لایا تھا اس سے تینوں بیٹیوں کی شادی کی اور پھر اپنی بیوی کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگا۔

ہاں اس کی بیوی اپنی حماقت میں یکتائے روزگار رہی۔

ہنگری

جپسی اور شیطان

جپسی (GYPSY) یا خانہ بدوش، ایک ایسی نسل ہے۔ جو یورپ میں صدیوں سے گھوم رہی ہے۔ قرونِ وسطیٰ سے یہ لوگ انگلستان سے لے کر پولینڈ اور روس سے لے کر اسپین تک خانہ بدوش زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ریاستوں کے جدید آئین بھی انھیں ایک ملک یا علاقے میں مستقل طور پر رہائش کے لیے مجبور نہیں کر سکے۔ انھوں نے اپنی بودو باش، اپنا مذہب اور اپنی زبان کو خارجی اثرات سے محفوظ رکھا۔ ان کی اصل تاریخ پر ابھی تک ماضی کی گرد چھائی ہوئی ہے۔

گزشتہ پچاس سال سے جپسی مورخوں کی تحقیق کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ اور کافی حد تک خانہ بدوش نسل کے ماضی اور حال پر روشنی پڑی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق یہ لوگ وسط ایشیا سے یورپ میں وارد ہوئے تھے۔ اور آج تک قرونِ وسطیٰ کی مانند زندگی بسر کرتے ہیں۔

جپسی پیدائشی قصّہ گو ہے۔ اور اس کے قصّے کہانیاں سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتے ہیں۔ "جپسی اور شیطان" ہنگری کے خانہ بدوشوں کی مخصوص موسیقی کا گھر سمجھا جاتا ہے —— یہ شیطان اور انسان کی ازلی جنگ کا قصّہ ہے:

جپسی اور شیطان

ایک دفعہ جپسی ایک سرائے میں داخل ہوا۔ اور اس نے اپنی سارنگی پر اس قدر دل گیر، غم ناک اور بے حد موثر گیت سنایا کہ گھاس اور جھاڑیوں کے پتے شبنم سے تر ہو گئے۔ جیسے کہ وہ آنسو بہا رہے ہوں۔ گیت کے بول یہ تھے:

ایک قیدی کی مانند میری حفاظت کی جاتی ہے۔
میری دائیں طرف میرا سایہ موجود رہتا ہے۔
میرے عقب میں میرے خیالات۔
یوں کھڑے ہیں۔
جیسے کوئی بڑا ہی ظالم اور تند خو
محافظ پہرے پر کھڑا ہو۔

اس کا یہ گیت ایک شکوہ، ایک پکار اور ایک التجا تھی کہ ازل میں سے غربت، حقارت، بے زاری اور ابدی سفر کیوں اس کے حصّے میں آیا ہے ــــ اس مدہوش کن لیکن غم ناک موسیقی کو مغرب کی ہَوا نے اپنے دوش پر دُور دور تک پہنچا دیا۔ اور جب یہ ہَوا دُور جھاڑیوں اور پودوں میں سے گزری تو وہ آوازِ باز گشت میں بدل گئی۔ جس میں خانہ بدوش کی روح کے صدیوں پُرانے غم کی پکار تھی۔

شیطان ایک دلدل کے کنارے مرغزار میں رہتا تھا۔ اُس نے پکار سُنی اور اس کا دل رحم سے بھر گیا۔ اور اس نے جپسی کی مدد کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اتنے میں جپسی گاتا اور سارنگی بجاتا وہاں سے گزرا تو ایک اجنبی خشک گھاس سے کود کر اس کے سامنے آ گیا۔ وہ شکل و صورت سے ایک جرمن معلوم ہوتا تھا۔ اس کے مُنہ میں پائپ، جسم پر فراک کوٹ اور سر پہ مخملی ٹوپی تھی۔ جپسی سرائے سے اتنی دور اجنبی کو دیکھ کر بہت حیران ہوا۔

"کیا بات ہے؟" شیطان نے اسے سرتاپا دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا مجھ سے ڈر گئے ہو، گانا بجانا کیوں بند کر دیا ہے؟"

"مَیں کاہے کو ڈروں مسٹر جرمن!" جپسی نے چالاکی سے جواب دیا۔ کیونکہ اس نے اجنبی کے سر پر دو سینگ دیکھ لیے تھے۔ جو شیطان کا مخصوص نشان ہے۔ اور سینگ ٹوپی میں اچھّی طرح چھپے ہوئے نہ تھے۔

"اچھا ــــ اگر میں شیطان ہوتا تو کیا تم مجھ سے ڈرتے؟"

"آہ ــــ" جپسی نے اپنا سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔ "کیا شیطان جرمن سے زیادہ خوفناک ہوتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت میں شیطان ہی سے ملنے کا خواہش مند ہوں۔ شاید میرے اس بُرے وقت میں وہ میری کوئی مدد کرسکتا۔"

"خوب خوب!" شیطان نے جواب دیا۔ "اگر یہ معاملہ ہے تو کہو۔ میں ہی وہ ہوں جس کی تمھیں تلاش ہے۔ میں تمھاری مدد ضرور کروں گا۔"

"بے شک تم میری مدد ضرور کروگے۔" جپسی نے جواب دیا۔ "لیکن تم نے یہ رُوپ کس مقصد کے لیے دھارا ہے۔ مجھے تو اس کی پروا نہیں کہ تم شیطان ہو یا جرمن ــــ میں تو صرف امداد چاہتا ہوں۔"

"بہت اچھا" شیطان نے جواب دیا۔ "لیکن تمھیں وہ چیز دینی پڑے گی جو تمھیں سب سے عزیز ہے۔"

"میرے پاس ہے کیا، جسے میں عزیز سمجھتا ہوں۔ البتہ یہ سارنگی ہے۔"

"ہاں یہی" شیطان نے جلدی سے کہا۔ "تم مجھے اپنی سارنگی دے دو۔"

'آہ' سوچ میں ڈوبتے ہوئے جپسی کے مُنہ سے نکلا اور کچھ دیر بعد زیرِ لب مسکراتے ہوئے اس نے پُوچھا۔

"مسٹر شیطان تم اس سارنگی کا کیا کروگے؟"

میں اسے بجاؤں گا اور میری خواہش کے مطابق لوگ میرے پیچھے پیچھے چلے آئیں گے۔

"بہت خوب۔ مگر پہلے تم وعدہ تو پورا کرو۔"

بڑی خوشی سے میں اپنا وعدہ پورا کرتا ہوں۔ لیکن یاد رہے کہ تمھاری سارنگی اب میری ہو چکی ہے۔ دوسری صورت میں اس کا نتیجہ تمھارے لیے بہتر نہ ہوگا۔ اب اس دلدلی گھاس پر یوں بیٹھ جاؤ، جیسے کہ یہ ایک گھوڑا ہے۔ اور میرے پیچھے چلے آؤ۔

جپسی نے شیطان کا حکم مانا۔ اور دوسرے لمحے وہ دونوں مشرق کی سمت ہوا میں اُڑنے لگے۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ جب شیطان اور جپسی اپنے ہوائی گھوڑوں سے دریائے یاموس کے کنارے اترے۔ یہ دریا بلند چٹانوں میں بہہ رہا تھا۔ شیطان نے جپسی کا ہاتھ پکڑا اور آبشار کی طرف لے چلا۔ اور جہاں پانی بہت کم تھا۔ وہاں سے مٹھی بھر گیلی مٹی اٹھا کر جپسی کو دی۔

"میرا وعدہ تو یہ ہے" شیطان نے کہا۔" اس دریا کی اور اس آبشار کے پیچھے غار سونے سے بھری پڑی ہے۔ یہ سب تمھارا ہے۔ اب سارنگی میرے حوالے کر دو۔"

جپسی نے حیرانگی سے مٹی کو دیکھا، جو سونے کی مانند چمک رہی تھی۔ کچھ دیر بعد جیسے کہ اسے یقین نہ آتا ہو۔ وہ فوراً آگے بڑھا اور مٹی و ریت کو اٹھایا واقعی وہ اصل سونا تھا۔

"بے شک تم نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے"۔ جپسی نے کہا۔" اب میری باری ہے۔ مگر مجھے اتنی اجازت دو کہ آخری بار سارنگی بجا لوں"۔ پھر جپسی نے ایسے دردناک انداز میں سارنگی بجائی کہ نہ صرف شیطان بلکہ آسمان کے

بھی آنسو نکل پڑے۔

جپسی نے آخری لَے کے بعد سارنگی کو چوما اور ایک سوراخ پر اپنے ہونٹ رکھ کر زور سے سانس کھینچ لیا۔ اور پھر سارنگی شیطان کے حوالے کر دی۔ جو فوراً دھند کی مانند غائب ہو گیا۔ جپسی نے اپنا پائپ بھرا اور اسے سلگا کر بڑے اطمینان سے دریا کی تہہ میں سونا نکالنے میں مصروف ہو گیا۔

تین دن کے بعد جپسی بڑا مالدار ہو چکا تھا۔ لیکن سارنگی کے لیے اس کی بے چینی بڑھتی گئی۔ وہ تھک کر چُور ہو چکا تھا۔ بوجھل دل سے سونے کے ایک انبار پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ "شیطان تم بڑے چالاک بنے پھرتے ہو۔ لیکن میں بھی کوئی احمق نہیں۔ میں نے تمھیں سارنگی دی ہے اپنی روح نہیں جو اس کے تاروں پر کھیلتی تھی۔

اچانک وہاں شیطان نمودار ہوا۔ اور سارنگی جپسی کو واپس کرتے ہوئے بولا۔

"میں بڑے گھاٹے میں رہا۔ تمھارے پاس تو سونا ہے۔ لیکن یہ سارنگی لوگوں کو اپنے پیچھے لگانے کی بجائے بھگا دیتی ہے۔ جب میں اسے بجاتا ہوں تو لوگ خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگ جاتے ہیں۔ میں شیطان ہونے کے باوجود اسے تمھاری طرح بجا نہیں سکتا۔ لیکن رخصت ہونے سے پہلے مجھے اتنا تو بتاؤ کہ جب تم سارنگی بجاتے ہو تو اس میں جادو کیسے بھر جاتا ہے۔"

"یہ تو معمولی بات ہے"۔ جپسی نے سارنگی لیتے ہوئے کہا "میں نے تمھیں وعدے کے مطابق ساز دیا تھا۔ لیکن روح نہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے سارنگی کے ایک سوراخ پر اپنے ہونٹ رکھے اور اس میں اپنا سانس ڈالا۔ اور پھر اس نے سارنگی پر اتنی جوشیلی رقص کی دُھن شروع کی کہ شیطان بے اختیار ہو کر ناچنے لگا۔

جپسی خود بھی حیران تھا کہ اس سے پہلے اس نے سارنگی ایسی شاندار نہیں بجائی تھی۔

"ہوں۔ اب مجھے معلوم ہوا" شیطان نے کہا۔ "میں بڑا بیوقوف نکلا کہ ایک جپسی کے جھانسے میں آ گیا۔ تم نے سارنگی دی۔ لیکن اپنی رُوح کے بغیر ـــــ خیر جو ہوا سو ہو چکا۔ تمھارے پاس میرا سونا ہے اور اپنی سارنگی بھی۔ بہرحال تمھاری موسیقی آدمیوں کو میرے جال میں پھنساتی رہے گی۔"

اس وقت سے جب جپسی سارنگی بجاتے ہیں، تو شیطان ناچتا ہے جپسی کی موسیقی سُن کر لوگ پیسے دیتے ہیں کیونکہ وہی سارنگی اس شان سے بجا سکتا ہے۔

شیطان جپسی سے دھوکا تو کھا گیا تھا۔ تاہم اسے کوئی خاص نقصان نہیں ہوا۔ کیونکہ آج بھی آدمی اسی طرح اس کے جال میں پھنستے رہتے ہیں۔

فرانس

حُسن اور درندہ

فرانس اپنے ادب، آرٹ اور کلچر کے لحاظ سے یورپ میں انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ زمانۂ جدید میں فرانس کو وہی حیثیت حاصل ہے۔ جو زمانہ قبل از تاریخ یونان کو تھی ــــــ لہذا حُسن اور درندہ BEAUTY AND THE BEAST جو فرانس کی مشہور اور بہترین لوک کہانی ہے۔ اس پر بھی فرانس کا خاص رنگ موجود ہے۔

انتہائی کونوں پر یہ کہانی اٹھائی گئی ہے۔ حُسن اور درندگی دو متضاد خصائل کو اتنے خوبصورت اور موثر پیرائے میں سمو دیا گیا ہے۔ کہ داد دینے کے بغیر نہیں رہا جاتا۔ یہ کہانی تقریباً چار سو سال قدیم بیان کی جاتی ہے۔ جب فرانس میں جاگیرداری کا پورا عروج تھا۔

اس کہانی سے ہر نسل کے ادیب اور فن کار متاثر ہوئے ہیں اور انھوں نے مختلف انداز اور زاویوں سے اسے پیش کیا ہے۔

حُسن اور درندہ

ایک مالدار سوداگر کے تین بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ اس کی بیوی تو انتقال کر چکی تھی۔ مگر اس نے اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی اور انھیں بہتر انسان بنانے کے لیے بڑے قابل اور عالم اساتذہ کی خدمات حاصل کیں۔

تینوں بہنیں خوبصورت تھیں۔ لیکن سب سے چھوٹی حُسن اور اپنی پیاری طبیعت کی وجہ سے بڑی مقبول تھی۔ سب لوگ اسے خاندان کا حُسن کہتے تھے۔ جب وہ جوان ہوئی تو اس کا نام ہی حسینہ پڑ گیا۔ بہنیں اس کی تعریف اور حُسن سے جلنے لگیں۔

حسینہ نہ صرف اپنی بہنوں سے زیادہ حسین اور پیاری تھی۔ بلکہ بہتر

اخلاق، اچھی طبیعت، میٹھی زبان، مہربان اور قانع بھی تھی۔ اس کے برعکس اس کی دونوں بہنیں مغرور، ضدّی اور لالچی تھیں۔ وہ اپنے آپ کو بڑی بیگمات سمجھتیں اور اپنی ہم پلّہ دوسری لڑکیوں کو خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ اور اکثر ان سے ملاقات کرنے ہی سے انکار کر دیتی تھیں۔ وہ اپنا زیادہ وقت باغ، رقص گاہ یا تھیٹر میں گزارتی تھیں۔ وہ اکثر اپنی چھوٹی بہن کا مذاق اُڑایا کرتیں کیونکہ حسینہ اپنا وقت مصوّری سیکھنے یا موسیقی کی مشق اور یا پھر نامور ادیبوں کی کتابوں کے مطالعے میں صرف کرتی تھیں۔

لوگوں کو معلوم تھا کہ تینوں بڑے مال دار سوداگر کی بیٹیاں ہیں۔ اس لیے رئیس نوجوان ان سے شادی کی درخواست کرتے۔ بڑی بہنوں نے شادی کے ان پیغامات کو نفرت سے ردّ کر دیا۔ کیونکہ وہ کسی بڑے جاگیردار یا کسی نواب ہی کو شادی کے لائق سمجھتی تھیں۔ مگر جب کوئی نوجوان حسینہ سے شادی کی درخواست کرتا تو وہ بڑے پیارے لہجے میں اس کا شکریہ ادا کرتی اور کہتی کہ نوجوان نے اس کی عزّت افزائی کی ہے۔ مگر ابھی اس کا ارادہ شادی کرنے کا نہیں اور وہ چند سال اپنے والد کی خدمت گزاری میں بسر کرنا چاہتی ہے۔

اچانک سوداگر کو تجارت میں اتنا نقصان ہوا کہ وہ تقریباً اپنی کُل دولت کھو بیٹھا اور صرف اس کے پاس شہر سے دُور چند ایکڑ زمین اور ایک چھوٹی سی جھونپڑی رہ گئی۔

سوداگر نے ٹوٹے ہوئے دل سے اپنی اولاد کو بُلایا اور انھیں اس حادثے سے مطلع کیا۔ اور کہا کہ اب شہر چھوڑنے کی تیاری کرنا چاہیے۔ آئندہ وہ

شہر سے دُور ایک جھونپڑی میں نئے سرے سے زندگی شروع کریں گے۔ سخت محنت اور انتہائی کفایت شعاری سے وہ اس قابل ہو سکتے ہیں کہ عام کسانوں کی طرح سادہ زندگی بسر کر سکیں اور صرف یہی طریقہ دیانتداری سے زندگی بسر کرنے کا باقی رہ گیا ہے۔

شہر سے دُور ایک معمولی گاؤں میں رہائش کے خیال پر بڑی دو بہنوں نے قہقہہ لگایا۔ اور اپنے والد کو جواب دیا۔ کہ اگر وہ واقعی مفلس و قلاش ہو گئے ہیں تو کیا ہوا۔ محض خوبصورتی کی بنا پر ان سے کئی مالدار نوجوان شادی کرنے کے لیے تیار ہیں۔

مگر بدقسمتی سے دونوں بہنوں کو جلد ہی مایوس ہونا پڑا۔ شادی تو دُور کی بات تھی۔ جب ان کی جان پہچان کے رئیس نوجوانوں نے یہ سُنا کہ سوداگر اب مفلس ہو گیا ہے، تو ان میں سے کوئی بھی ان سے ملنے تک نہ آیا۔ چونکہ وہ اپنے پڑوسیوں سے ہمیشہ بدتمیزی سے پیش آتی تھیں۔ اس لیے ان کی اس افتاد پر کسی نے بھی افسوس کا اظہار نہ کیا۔ وہ اس قابل ہی نہیں کہ ان سے ہمدردی کی جائے۔ اچھا ہی ہوا کہ ان کا گھمنڈ تو ٹوٹا "عام طور پر لوگ یہی کہتے تھے۔ مگر اس کے برعکس چھوٹی بہن حسینہ کے متعلق پڑوسیوں کو یہ کہتے سنا گیا۔ " آہ بے چاری حسینہ! ہمیں بڑا افسوس ہے۔ وہ اتنی رحم دل اور مہربان ہے کہ آج تک اس نے کسی کا جی نہیں دکھایا۔

اس حسینہ کے پاس ایک کوڑی تک نہ تھی۔ تاہم کئی امیر نوجوان

اس سے شادی کرنے کے لیے تیار تھے۔ حسینہ نے ان نوجوانوں کا گہرے دل سے شکریہ ادا کیا اور انھیں بتایا کہ وہ مفلسی میں اپنے والد کو چھوڑ نہیں سکتی۔ بلکہ وہ اس کے ساتھ گاؤں جائے گی اور اس کی خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے گی۔

حسینہ کو دولت وامارت کھو جانے کا یقیناً افسوس تھا۔ اس کے برعکس تو وہ سوچ ہی نہیں سکتی تھی۔ مگر جب بھی اسے اپنے والد کی بدقسمتی پر رونا آتا تو وہ اپنے آپ سے کہتی۔

"میں آنسو کیوں بہاؤں ــــ آنسوؤں کا سمندر بھی ان مشکلات کو دُور نہیں کر سکتا۔ مجھے دولت کے بغیر ہی خوش رہنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جیسا کہ میرے گرد و پیش کئی مفلس لوگ اطمینان سے زندگی بسر کرتے ہیں"۔

سوداگر کا خاندان جب اپنی کٹیا میں پہنچا تو سوداگر نے اپنے تین بیٹوں کے ساتھ کھیتی باڑی شروع کر دی۔ حسینہ ہر صبح چار بجے اٹھتی۔ کٹیا کی صفائی کر کے سارے کنبے کے لیے کھانا تیار کرنے لگتی۔ آغاز میں تو اسے یہ کام بڑا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ آسان معلوم ہونے لگا اور چند ماہ کے بعد تو وہ گھر کے تمام کام معمولی سمجھنے لگی۔ تازہ ہوا اور گھر کے کام کاج سے وہ پہلے سے زیادہ تنومند ہو گئی۔ اور اس کا حسن زیادہ نکھر آیا۔ جب وہ اپنے گھریلو کام ختم کر لیتی تو پھر رباب بجانے لگتی یا چرخہ کاتتی اور اس دوران میں پیارے پیارے گیت گنگناتی تھی۔

اس کے برعکس اس کی بڑی بہنیں اپنی اس نئی زندگی سے بیزار تھیں۔

وہ صبح دس بجے سے پہلے بستر نہ چھوڑتی تھیں اور اپنا تمام وقت اِدھر اُدھر گھومنے میں ضائع کرتی تھیں۔ وہ ایک دوسری کو گزری ہوئی امارت و دولت کے قصے سُناتیں اور اپنے ریشمی اور قیمتی لباسوں کے چھن جانے اور ریشمی یا نہ سہیلیوں کی جُدائی پر پہروں افسوس کرتی تھیں۔ اور ساتھ ہی وہ حسینہ پر ناک بھوں چڑھاتیں کہ وہ اتنی ذلیل اور چھوٹے دل کی مالک ہے کہ وہ اس مفلسی اور غریبی میں بھی مطمئن ہو گئی ہے۔

لیکن ان کے والد کا ایسا خیال نہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ حسینہ اپنی بڑی بہنوں سے کہیں زیادہ امیرانہ شان کی مستحق ہے۔ وہ اپنی چھوٹی بیٹی کے اخلاق کا بڑا مداح تھا اور خاص طور پر حسینہ کی بُردباری اور بہنوں سے نرم سمجھاؤ سے بڑا خوش تھا۔ بڑی بہنوں نے گھر کا سارا کام کاج حسینہ پر چھوڑ رکھا تھا۔ اور جب حسینہ کوئی کام کر رہی ہوتی تو وہ اسے متواتر ذلیل کرتیں اور اس پر آوازے کستی تھیں۔

جب انھیں جھونپڑی میں رہتے ہوئے تقریباً ایک سال گزر گیا تو ایک روز سوداگر کو اطلاع ملی کہ جس جہاز میں اس کا قیمتی مال تھا۔ آخر وہ جہاز بندرگاہ پر آ لگا ہے۔ بڑی بہنیں تو اس خوش خبری کو سُن کر نڈھال ہو گئیں۔ اب وہ سمجھنے لگیں کہ وہ اس جھونپڑی کو جلد چھوڑنے کے قابل ہو سکیں گی۔ جہاں وہ اپنے آپ کو ایک مسلسل عذاب میں مبتلا سمجھتی تھیں۔ جب اُن کا والد شہر جانے لگا تو بڑی بہنوں نے ریشمی پوشاکوں اور خوبصورت زیورات اور موتی جڑے سرپوشوں کی ایک طویل فہرست بنا کر اسے دی۔ حسینہ نے

یہ دیکھ کر سوچا کہ جہاز کی پوری قیمت بھی بڑی بہنوں کی فرمائش پوری نہیں کر سکتی۔ اس لیے اس نے اپنے لیے کوئی فرمائش نہ کی۔

"حسینہ! کیا تم نہیں چاہتی کہ تمھارے لیے بھی شہر سے کچھ لیتا آؤں؟" اس کے والد نے پوچھا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ! اگر آپ لا سکیں تو گلاب کا ایک پھول میرے لیے لیتے آئیے۔ میں اسے پا کر بہت خوش ہوں گی۔ کیونکہ ہمارے باغیچے میں کوئی گلاب کا پھول نہیں ہے۔" حسینہ نے جواب دیا۔

دراصل حسینہ کو گلاب کے پھول کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔ مگر وہ یہ جانتی تھی کہ اگر اس نے کوئی فرمائش نہ کی تو اس کی بڑی بہنیں یہ خیال کریں گی کہ وہ اپنے آپ کو عام انسانوں سے بڑا بلند سمجھتی ہے اور اس خیال سے ان کا جی بُرا ہو گا۔ چونکہ پھول کوئی قیمتی شے نہیں۔ اسی لیے حسینہ نے گلاب کی فرمائش کی۔

سوداگر دل میں بڑی امنگیں اور خواہشات لے کر پہنچا۔ مگر کسی نے اس پر جھوٹا مقدمہ کھڑا کر دیا۔ مقدمہ تو وہ جیت ہی گیا۔ مگر وکیلوں کی فیسوں اور دوسرے اخراجات میں جہاز کی کُل قیمت اُٹھ گئی اور سوداگر جیسے خالی ہاتھ کُٹیا سے گیا تھا، ویسا ہی مفلس مگر پہلے سے زیادہ دل گیر واپس ہوا۔ راستے میں اپنے بچوں کو دیکھنے کی خواہش نے اس کی ہمت بڑھا دی۔ اور اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی تاکہ جتنی جلد ہو سکے، وہ اپنی کُٹیا میں پہنچ جائے۔

ابھی وہ اپنی کٹیا سے کوئی تیس میل دُور تھا کہ سخت برف باری شروع ہوگئی اور وہ بمشکل چند گز اپنے سامنے دیکھ سکتا تھا۔ سوداگر جس راستے سے گزر رہا تھا وہ ایک گھنے جنگل کی طرف جاتا تھا اور اس سے کئی پگ ڈنڈیاں نکلتی تھیں۔ برف باری کی وجہ سے وہ ایک غلط پگ ڈنڈی پر ہولیا اور وہ اس طرح صحیح راستے سے بھٹک گیا۔ تھوڑی دیر بعد زوردار آندھی چلنے لگی۔ وہ دو مرتبہ گھوڑے سے گرا۔ جب شام ہوگئی تو اتنا گھُپ اندھیرا چھا گیا کہ ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہ دیتا تھا۔ جنگل میں رات بسر کرنے کے خیال ہی سے وہ سخت پریشان ہوا۔ جب اس نے اپنے اِردگرد نظر دوڑائی تو یہ دیکھ کر کہ ابھی ہی سے بھیڑیے اس کے گرد چکر لگا رہے ہیں تو اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔

تھکا ماندہ اور بھوکا پیاسا گھوڑے سے نیچے اترا اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے لگا۔ پیدل چلنا ہی اس کے لیے بہتر تھا۔ کیونکہ گھوڑے پر بیٹھے ہوئے درختوں کی جھکی ہوئی شاخیں اس سے لپٹ جاتی تھیں۔ چلتے چلتے اچانک اس کی نظر دُور روشنی پر پڑی اور وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا روشنی کی طرف بڑھنے لگا۔ تھوڑی دُور چلنے کے بعد اسے ایک طویل مگر پختہ راستہ ملا۔ جس کے آگے بے شمار شمعیں روشن تھیں۔ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے وہ پھر گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ سمجھ دار گھوڑے نے جب روشنی دیکھی تو خود بخود پکے راستے پر سرپٹ دوڑنے لگا۔ اور چند لمحوں کے بعد وہ ایک عالی شان محل کی کھڑکیوں کے سامنے تھے۔ روشنی کے انتظام سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ کسی بڑی دعوت کا اہتمام تھا۔ مگر

عجیب بات تھی کہ محل میں کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا اور نہ ہی کسی قسم کی آواز آرہی تھی۔ ایک گہرا سکوت تھا جو محل کے اندر اور باہر چھایا ہوا تھا۔

محل کے وسیع صحن سے اصطبل کا دروازہ نظر آرہا تھا۔ گھوڑا خود بخود اصطبل کی طرف روانہ ہوگیا۔ اصطبل میں ہری ہری گھاس تھان میں پڑی تھی۔ گھوڑے نے فوراً منہ مارنا شروع کر دیا۔

سوداگر گھوڑے کو وہیں چھوڑ کر محل میں داخل ہوا۔ لیکن اسے کوئی انسان یا ذی روح نظر نہ آیا۔ محل کے ہال کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور انگیٹھی میں زور کی آگ جل رہی تھی۔ ہال کی چھت پر فانوس میں بے شمار شمعیں چکاچوند روشنی پھیلا رہی تھیں۔ کمرے کے وسط میں میز پر صرف ایک آدمی کا کھانا چنا ہوا تھا۔ سوداگر کا لباس شرابور تھا اور سخت سردی سے وہ بری طرح ٹھٹھر رہا تھا۔ سیدھا جاکر وہ انگیٹھی کے پاس کھڑا ہوگیا۔ اور دل میں کہنے لگا۔ "میری یہ حالت دیکھ کر محل کا مالک یقیناً مجھے معاف کردے گا۔ میرا خیال ہے کہ مالک یا ملازم ابھی آتے ہوں گے۔

کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بھی جب کوئی نہ آیا، اور دیوار پر لگے کلاک نے گیارہ بجائے تو وہ زیادہ انتظار نہ کرسکا۔ وہ بھوک سے نڈھال ہو رہا تھا آہستہ سے اس نے طشتری سے بھنا ہوا چوزا اٹھایا اور جلدی جلدی کھانے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ خوف سے کانپ بھی رہا تھا۔ اور آنے والے نامعلوم واقعات سے ڈر بھی رہا تھا۔ جب پھر بھی کوئی نہ آیا تو اس نے میز سے اعلیٰ درجے کی شراب کا ایک گلاس انڈیلا اور اسے غٹاغٹ چڑھا گیا۔ پھر اس نے یکے بعد

دیگرے تین چار گلاس چڑھا لیے۔ اس طرح اس کا حوصلہ بڑھا۔ اور ہال سے نکل کر مختلف کمروں میں پھرنے لگا۔ ہر کمرہ نہایت نفیس سامان سے سجا ہوا تھا۔ اس کی نظر سونے کے کمرے میں پڑی۔ جو خاص طور پر مہمان ہی کے لیے تیار کیا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ نصف رات بیت چکی تھی۔ سوداگر بڑی تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ رات وہ اس کمرے میں بسر کرے گا۔ اور اندر سے دروازے پر تالا لگالے گا۔

دوسری صبح دس بجے کے قریب اس کی آنکھ کھُل گئی۔ سب سے پہلے جس چیز پر اس کی نظر پڑی۔ وہ نفیس اور عمدہ پوشاک تھی۔ یہ پوشاک اسی جگہ رکھی تھی۔ جہاں سوداگر نے رات کو اپنا کیچڑ سے لت پت لباس اُتار رکھا تھا۔ اس نے دل میں سوچا یہ محل یقیناً کسی پری کا ہے جس نے مجھ پر رحم کھایا ہے وہ بستر سے اٹھا اور کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگا۔

برف کا نام و نشان تک نہ تھا۔ چمکتی ہوئی دھوپ میں ہری گھاس کے تختے اور ان پر دو رویہ درختوں کی قطاریں عجیب بہار دکھا رہی تھیں۔ باغ کے ہر تختے کے درمیان ایک فوّارہ تھا۔ جس کے اِرد گرد پیارے پیارے اور رنگ برنگے پھولوں کی کیاریاں قرینے سے لگی تھیں۔

سوداگر نے جلدی سے لباس تبدیل کیا اور ہال کمرے میں پہنچا، جہاں اس نے رات کھانا کھایا تھا۔ اب اس نے دیکھا کہ اس میز پر لذیذ چاکلیٹ کی ایک گرم پیالی اور چند توس پڑے تھے۔

شکریہ! میری اچھی مہربان پری شکریہ"۔ سوداگر نے کہا "آپ نے مجھ

غریب کے ناشتہ کا بھی خیال رکھا۔ چائے پینے کے بعد وہ اپنے گھوڑے کو دیکھنے کے لیے اصطبل میں جانے لگا۔ تو باغ سے گزرتے ہوئے اسے گلاب کے پھول نظر آئے۔ پھول دیکھتے ہی اُسے حسینہ کی فرمائش یاد آگئی۔ سوداگر آگے بڑھا اور گلاب کے پودے کی ایک شاخ توڑلی۔ اس شاخ پر چند خوبصورت پھول لٹک رہے تھے۔ جونہی یہ شاخ اس کے ہاتھ میں آئی تو ایک ہیبت ناک آواز بلند ہوئی۔ سوداگر نے جلدی سے مڑکر اپنے پیچھے دیکھا تو ایک نہایت ہی خوفناک اور مکروہ درندہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی سوداگر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"ناشکرے! خبیث بڈھے!" درندے نے رونگٹے کھڑے کردینے والی آواز سے کہا۔ "تمھیں اپنے محل میں جگہ دے کر تمھاری جان بچائی۔ اور احسان مندی کی بجائے میرے پیارے پھولوں کو ہتھیانے لگے ہو۔ یہ پھول ہی میرے لیے سب سے زیادہ عزیز ہیں۔ اس جرأت کے لیے تمھیں اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ میں تمھیں صرف پندرہ منٹ دیتا ہوں۔ اپنی موت کے لیے تیار ہو جاؤ۔

یہ سُن کر سوداگر بڑی طرح کانپنے لگا۔ اور ہاتھ باندھ کر گھٹنوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ اور گڑگڑا کر التجا کرنے لگا۔

"میرے آقا مجھے معاف کر دیجیے۔ میں حضور کو ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے تو صرف اپنی بیٹی کی فرمائش پوری کرنا چاہی تھی۔ جس نے مجھے ایک گلاب کا پھول لانے کے لیے کہا تھا۔"

"آقا نہیں بلکہ مجھے درندہ کہا جاتا ہے۔ میں خوشامد سے سخت نفرت کرتا ہوں کہ لوگ وہی زبان پر لائیں جو ان کے دل میں ہو۔ اس لیے خوشامد اور تعریف سے میرے ارادے کو بدلنے کی کوشش نہ کرو۔ ہاں ابھی ابھی تم نے کہا ہے کہ تمھاری بیٹیاں ہیں۔ اگر تمھاری کوئی بیٹی اپنی منشا اور رضامندی سے یہاں آئے اور تمھارے بدلے اپنی جان دینا چاہے، تو پھر میں تمھیں معاف کرنے کے لیے تیار ہو سکتا ہوں۔ مَیں تم سے کوئی دلیل نہیں سنوں گا۔ میں تمھیں اپنا ارادہ بتا چکا۔ اب یہاں سے نکل جاؤ ــــــ ہاں اگر تمھاری بیٹیوں میں سے کوئی تمھاری بجائے مرنے کے لیے تیار نہ ہو، تو پھر مجھے حلف دو کہ تم آج سے پورے تین مہینے بعد یہاں واپس آجاؤ گے۔"

نیک دل سوداگر اپنی کسی بیٹی کو بھی قربان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اس صورت میں آخری بار وہ اپنی اولاد کو دیکھ سکتا تھا اور ان سے رخصت بھی ہو سکتا تھا اس لیے سوداگر نے واپس آنے کا حلف اٹھایا۔ اس کے بعد درندے نے کہا کہ جب سوداگر کا جی چاہے وہ اپنی کٹیا میں جا سکتا ہے۔

"میں یہ نہیں چاہتا کہ تم میرے گھر سے خالی ہاتھ جاؤ۔ جس کمرے میں تم نے رات بسر کی تھی، وہاں تمھیں ایک صندوق ملے گا اور کمرے میں جو چیز تمھیں پسند آئے، اسے صندوق میں ڈال سکتے ہو۔ یہ میرا کام ہو گا کہ وہ صندوق تمھاری کٹیا میں پہنچ جائے۔"

یہ کہہ کر درندہ یک لخت غائب ہو گیا۔ سوداگر نے یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دی کہ اگر اسے یوںہی درندے کے ہاتھوں مرنا ہے تو کم از کم کچھ دولت تو

اپنی اولاد کے لیے چھوڑ سکتا ہے۔ وہ سونے کے کمرے میں گیا۔ فرش پر بیشمار اشرفیاں بکھری پڑی تھیں۔ ان کے پاس ایک صندوق تھا۔ سوداگر نے اشرفیوں سے صندوق بھر کر تالا لگا لیا اور خود اصطبل میں پہنچا، اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر بڑا ہی دل گیر کٹیا کی طرف روانہ ہوا۔ گھوڑا خود بخود اپنے راستے پر چلنے لگا کہ چند گھنٹوں میں وہ اپنی کٹیا کے سامنے تھا۔

جب وہ کٹیا میں داخل ہوا۔ تو اس کے بیٹے اور بیٹیاں خوشی کے مارے چمٹ گئیں۔ انھیں پیار کرنے کی بجائے سوداگر کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو پھوٹ پڑے۔ اس کے ہاتھ میں ابھی تک گلاب کے پھولوں کی شاخ تھی۔ چند لمحات کے بعد جب وہ بولنے کے قابل ہوا، تو اس نے حسینہ کو شاخ دیتے ہوئے کہا۔

"میری حسینہ لو یہ گلاب۔ مگر یہ پھول تمہارے بدقسمت باپ کو بڑے مہنگے پڑے ہیں۔"

پھر اس نے تمام واقعہ سنایا۔ بڑی دو لڑکیاں چیخ چیخ کر رونے لگیں اور ساتھ ہی حسینہ کو جلی کٹی سنانے لگیں۔

حسینہ خاموشی سے یہ سب کچھ سنتی رہی۔

"ذرا خیال تو کرو کہ اس ذلیل چھوکری کے غرور نے کیا گل کھلایا ہے۔ کیا یہ ہماری طرح کار آمد کپڑوں کی فرمائش نہیں کر سکتی تھی؟"

"نہیں یہ لڑکی اپنے آپ کو ہم سے نمایاں کرنا چاہتی تھی۔ لو دیکھو اب اپنے باپ کی موت کا سبب بنی ہے۔ مگر مجال ہے کہ آنکھوں سے ایک قطرہ

بھی ٹپکا ہو۔

تب حسینہ بولی۔ "اب رونا دھونا فضول ہے۔ میں والد کی موت پر کیوں چیخوں جب کہ مجھے معلوم ہے کہ وہ نہیں مریں گے۔ درندہ ان کے بدلے ان کی ایک بیٹی کو ہلاک کرنا چاہتا ہے نا۔ تو بس میں مرنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے اپنی قربانی دینے میں فخر ہو گا۔ میں اپنے والد کی جان ضرور بچاؤں گی۔"

"نہیں پیاری بہن نہیں۔" تینوں بھائی ایک دم بول اٹھے۔ "ہم درندے کو تلاش کریں گے۔ اسے ہلاک کر دیں گے یا خود مر جائیں گے۔"

"یہ خیال دل سے نکال دو۔" سوداگر نے کہا۔ "درندے کی طاقت اتنی زبردست ہے۔ کہ مجھے امید نہیں اسے کوئی مار بھی سکتا ہے۔ میں حسینہ کی اس پیش کش سے بہت خوش ہوا ہوں۔ مگر میں اپنی پیاری بیٹی کی جان خطرے میں ڈال نہیں سکتا۔ میں بوڑھا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ چند سال اور زندگی ہو گی۔ مجھے مرنے کا کوئی افسوس نہیں۔ صرف تمھیں بے آسرا چھوڑنے کا خیال ستاتا ہے۔

"میرے پیارے ابا! میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں آپ کو تنہا درندے کے پاس جانے نہ دوں گی۔ میں آپ کے پیچھے پیچھے چل پڑوں گی۔ اس طرح مجھے کوئی روک نہیں سکتا۔ میں نو عمر ہوں۔ مگر مجھے زندگی سے پیار نہیں۔ والد کی موت کے غم میں جان دینے کی بجائے درندے کے ہاتھوں مرنا بہتر سمجھتی ہوں۔"

حسینہ کو اپنے ارادے سے روکنا ناممکن تھا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ

وقت آنے پر وہ اپنے والد کے ساتھ جائے گی۔ یہ سن کر اس کی بڑی بہن بڑی مشکل سے اپنی خوشی چھپا سکیں۔ سوداگر اپنی چہیتی بیٹی حسینہ کی موت کے خیال ہی سے اتنا دُکھی ہوا کہ وہ اشرفیوں اور صندوق کے بارے میں بات کرنا بھول گیا۔

رات کو جب سوداگر اپنے کمرے میں سونے کے لیے گیا۔ تو اس نے وہی صندوق اشرفیوں سے بھرا ہوا پایا۔ اس نے فوراً یہ ارادہ کر لیا کہ وہ اپنی دو بڑی بہنوں کو ان اشرفیوں کے متعلق کچھ نہیں بتائے گا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ دولت کو سن کر وہ شہر کی نمائش اور کھوکھلی زندگی میں واپس جانے کی خواہش کریں گی۔ سوداگر کا خیال تھا کہ وہ اپنی باقی زندگی گاؤں میں گزارے گا۔

اس نے حسینہ کو صندوق کی موجودگی بتائی۔ یہ سن کر حسینہ کو فوراً خیال آیا کہ وہ والد کو یہ بتانا بھول گئی ہے کہ اس کی غیر حاضری میں دو نوجوان یہاں آتے رہے ہیں اور وہ دونوں بڑی بہنوں کی محبت کا دم بھرتے ہیں۔ نیک دل حسینہ نے اپنے والد کو مشورہ دیا کہ اشرفیوں کا بڑا حصّہ بہنوں کی شادی پر صرف کیا جائے۔ اور کچھ اشرفیاں انھیں دی بھی جائیں۔ وہ اپنی بہنوں کی سخت کلامی کے باوجود انھیں بہت چاہتی اور انھیں خوش دیکھنا چاہتی تھی۔

جب درندے کے پاس جانے کا وقت آیا، تو بڑی بہنوں نے دیکھا کہ حسینہ والد کے ساتھ جانے کو بالکل تیار ہے تو انھوں نے اپنی پلکوں

پر پیاز کا پانی لگا لیا تاکہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے نظر آئیں۔ اور یہ ظاہر ہو کہ واقعی انھیں اپنی بہن کی جُدائی کا بڑا ہی صدمہ ہے۔ مگر تینوں بھائی اور والد حسینہ کی جُدائی کے خیال سے جی بھر کر روئے۔ صرف حسینہ کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے کیونکہ وہ خود آنسو بہا کر ان کے غم میں اضافہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔

باپ بیٹی گھوڑے پر سوار ہو کر محل کی طرف روانہ ہوئے گھوڑا خود بخود محل کے راستے پر ہو لیا۔ اور وہ شام کو محل میں پہنچ گئے۔ پہلے کی مانند محل روشنی سے جگ مگ کر رہا تھا۔ گھوڑا سیدھا اصطبل میں چلا گیا اور باپ بیٹی محل میں داخل ہوئے۔ میز پر دو آدمیوں کے لیے بہترین کھانا چُنا ہُوا تھا۔ سوداگر اتنا افسردہ تھا کہ اس نے کھانے کی طرف توجہ نہ دی۔ مگر حسینہ بڑی کوشش کے بعد یہ ظاہر کرنے میں کامیاب ہو گئی کہ اسے مطلقاً کسی قسم کا خوف نہیں۔ آگے بڑھ کر وہ میز پر بیٹھ گئی اور اپنے والد کو اس پسندیدہ کھانے کی طشتریاں دینے لگی۔ جب دونوں کھانا کھا رہے تھے، تو حسینہ کو خیال آیا۔

"نگلنے سے پہلے درندہ مجھے موٹا کرنا چاہتا ہے۔ تبھی تو اس نے ایسی دعوت کا بندوبست کیا ہے؛" جب انھوں نے کھانے سے ہاتھ اٹھایا۔ تو کمرے میں ایک عجیب گونج پیدا ہوئی۔ سوداگر کو محسوس ہوا کہ درندہ آ رہا ہے۔ اور ساتھ ہی وہ بُری طرح کانپنے لگا۔ اور زار و قطار روتے ہوئے اپنی پیاری بیٹی کو الوداع کہنے لگا۔

جونہی حسینہ کی نظر ہیبت ناک درندے کے خونخوار اور مکروہ چہرے پر پڑی۔ تو وہ بھی خوف کے مارے بُری طرح لرزنے لگی۔ مگر خوف پر قابو

پڑنے میں اس نے بڑی ہمت دکھائی۔ جب اس مکروہ اور خوفناک درندے نے اس سے پوچھا کہ واقعی وہ اپنی مرضی سے یہاں آئی ہے تو حسینہ ایک بار پھر سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی۔ مگر اس نے دلیری سے جواب دیا۔

"ہاں"۔

"تم بڑی اچھی لڑکی ہو، اور میں تمھارا شکرگزار ہوں"۔ یہ کہہ کر درندہ سوداگر کی طرف متوجہ ہوا اور اس سے کہا۔

"بڑے میاں! آپ کل صبح یہاں سے تشریف لے جائیے اور پھر یہاں واپس آنے کا خیال بھی نہ کیجیے۔ شب بخیر میری حسینہ"۔

"شب بخیر درندے" حسینہ نے جواب دیا۔ اور درندہ فوراً وہاں سے غائب ہو گیا۔

"آہ میری بچی! ڈر کے مارے میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔ اب بھی میرا کہنا مان لو اور مجھے یہاں رہنے دو۔" سوداگر نے اپنی بیٹی کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

"نہیں میرے پیارے ابا! آپ کل گھر تشریف لے جائیے اور مجھے قدرت کے سپرد کر دیجیے۔ جو شاید میرے حال پر رحم کر دے"۔

اس کے بعد وہ سونے کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ رات بھر انھیں نیند نہیں آئے گی۔ مگر جونہی ان کے سر تکیے سے چھوئے تو ان پر گہری غنودگی چھا گئی۔

حسینہ نے خواب میں ایک انتہائی خوبصورت عورت کو دیکھا۔ عورت

نے اس سے کہا، حسینہ! میں تمہاری رحم دلی سے بہت خوش ہوئی۔ تم اپنے والد کی بجائے اپنی جان قربان کر رہی ہو، تمہیں اس کا صلہ ضرور ملے گا۔

صبح حسینہ نے یہ خواب اپنے والد کو سنایا تو سوداگر کو کچھ ڈھارس بندھی۔ مگر جب بیٹی سے رخصت ہونے کا وقت آیا تو سوداگر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

آخر سوداگر نظروں سے اوجھل ہو گیا تو حسینہ نے اپنے آپ کو ایک صوفے پر گرا دیا اور ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ جیسا کہ اس کا دل ٹوٹ چکا ہو۔ رونے کے بعد جب اسے کچھ سکون ملا تو پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور خود کو خدا کے سپرد کر کے اٹھی۔ اُسے یقین تھا کہ شام کو درندہ اُسے نگل جائے گا۔ تاہم اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ زندگی کے آخری چند گھنٹے رونے دھونے میں ضائع نہیں کرے گی۔

وہ ہال سے نکل کر محل کے خوشنما باغ کی سیر کرنے لگی۔ پھر وہ محل کے مختلف کمروں کو دیکھنے لگی۔ ان کمروں کی سجاوٹ اور نفیس ساز و سامان کی تعریف کیے بغیر وہ رہ نہ سکی۔ ایک دروازے پر سنہری حروف میں لکھا تھا:۔

"حسینہ کا خاص کمرہ"۔

یہ پڑھ کر وہ بڑی حیران ہوئی۔ جلدی سے اس نے اس کمرے کا دروازہ کھولا۔ اور اندرونِ کمرے کو دیکھ کر وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ آسائش و آرام کی ہر وہ چیز موجود تھی جس کی حسینہ خواہش

کر سکتی تھی۔ سب سے پہلے جس چیز پر اس کی نظر پڑی وہ کتابوں کی نہایت ہی نفیس الماری تھی، جس میں حسینہ کے پسندیدہ اور ادیبوں کی خوش نما تصنیفیں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ الماری کے پاس ہی خوب صورت طاؤس پڑا تھا اور اس کے نزدیک ہر قسم کی موسیقی کی کتابیں پڑی تھیں۔

"درندہ مجھے اُداس و پریشان رکھنا نہیں چاہتا۔ اگر مجھے صرف آج کے روز ہی زندہ رہنا ہوتا۔ تو پھر درندہ میرے لیے اتنا سامان کیوں فراہم کرتا۔" یہ سوچ کر حسینہ کو کچھ ڈھارس ہوئی۔

اس نے الماری کھول کر ایک کتاب نکالی۔ کتاب کے پہلے صفحہ پر لکھا تھا۔

"خواہش کرو، حکم دو! تم یہاں کی مالکہ ہو۔"

افسوس! حسینہ نے آہ بھرتے ہوئے سوچا۔ مجھے کسی چیز کی خواہش نہیں۔ بلکہ ایک بار اپنے والد کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ معلوم نہیں کہ وہ اس وقت کس حال میں ہیں۔ پھر اس نے کتاب کو الماری میں رکھ دیا۔

حسینہ کی حیرانگی کا اندازہ آپ ہی کیجیے کہ جب دیوار پر لگے ہوئے بڑے آئینے میں اس نے اپنی جھونپڑی دیکھی، جس کے دروازے پر اس کا والد پہنچا ہی تھا۔ وہ غم سے نڈھال دکھائی دیتا تھا۔ حسینہ کی بڑی بہنیں اپنے باپ سے ملنے کے لیے باہر آئیں۔ اور ایسا ظاہر کرنے لگیں کہ جیسے انھیں بڑا ہی افسوس ہے۔ چہرے پر جھوٹے غم کے اثرات کے باوجود ان کی آنکھوں سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔ وہ مسرور تھیں کہ والد حسینہ کے بغیر واپس آیا ہے۔ ساتھ ہی یک لخت یہ منظر غائب ہوگیا۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی

یہ سوچنے پر مجبور تھی کہ درندہ کتنا مہربان اور رحم دل ہے۔ وہ اسے خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ اب اسے درندے سے اتنا ڈرنا نہیں چاہیے۔

دوپہر کو خود بخود حسینہ کے مرغوب کھانے میز پر چُنے گئے۔ اور جب وہ کھانے کے لیے بیٹھی تو کمرے میں ہلکی اور دھیمی موسیقی شروع ہو گئی۔ جیسے کئی سازندے مختلف ساز بجا رہے ہوں۔ مگر اسے کمرے میں کوئی ذی روح نظر نہ آیا۔

شام کو جب وہ کھانا کھانے لگی، تو درندے کی آمد کی ہیبت ناک گونج پیدا ہوئی۔ اور درندے کو دیکھ کر وہ بُری طرح کانپنے لگی۔

"حسینہ! مجھے اجازت ہے کہ یہاں بیٹھ کر صرف تمہیں دیکھتا رہوں۔" درندے نے پوچھا۔

"آپ مالک ہیں" حسینہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"نہیں تم یہاں کی مالکہ ہو۔ اگر میری موجودگی تمھیں ناگوار گزرتی ہے۔ تو تم حکم دو اور میں ابھی یہاں سے ہٹ جاتا ہوں —— مجھے صاف صاف بتاؤ کہ واقعی میں بہت مکروہ ہوں! ——" درندے نے پوچھا

"جی ہاں۔ میں جھُوٹ نہیں بول سکتی۔ میرا خیال ہے کہ آپ بڑے رحم دل ہیں۔"

"سچ کہتی ہو۔ مکروہ ہونے کے ساتھ ساتھ میں احمق بھی واقع ہوا ہوں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں بے وقوف ہوں۔" درندے نے کہا۔

دراصل جو یہ سمجھتا ہو کہ وہ چالاک نہیں تو وہ احمق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ

بے وقوف اپنے آپ کو بے وقوف نہیں کہتا۔" حسینہ نے جواب دیا۔

"حسینہ! کھانے سے لطف اٹھاؤ۔ جو کچھ محل میں دیکھ رہی ہو وہ تمھارا ہے۔ تمھاری اُداسی اور پریشانی سے مجھے بڑا دُکھ ہوگا۔ درندے نے کہا۔

"آپ مہربان ہیں۔ آپ کی نیک دلی سے میں بہت خوش ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کی نیکی کا خیال کرتی ہوں۔ تو پھر مجھے آپ اتنے مکروہ معلوم نہیں ہوتے۔" حسینہ نے کہا۔

"آہ جہاں تک میرے دل کا تعلّق ہے میں بہت نرم دل ہُوں۔ مگر پھر بھی درندہ ہوں"۔ درندے نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"کئی آدمی آپ سے کہیں زیادہ درندے ہوتے ہیں۔ میں ایسے آدمیوں کو جانتی ہوں، جو اپنے خوبصورت چہروں کے عقب جھوٹا اور کمینہ دل چھپائے ہوتے ہیں۔ اور میں آپ کو ایسے آدمیوں سے بہتر سمجھتی ہوں"۔ حسینہ نے کہا۔

"اگر میں ذہین اور ہوشیار ہوتا تو بہترین الفاظ میں تمھارا شکریہ ادا کرتا۔ کہ تمھاری باتوں سے میں بہت خوش ہوا ہُوں اور میں تمھارا بے حد ممنون ہوں"۔ درندے نے کہا۔

یہ سُن کر حسینہ نے اطمینان سے کھانا کھایا اور اس کے دل سے درندے کا قدرے خوف جاتا رہا۔ مگر وہ خوف سے ایک بار پھر کانپ اٹھی۔ جب درندے نے پوچھا۔

"حسینہ! کیا تم میری بیوی بننا منظور کرو گی؟"

چند لمحات تک حسینہ سکتے کے عالم میں رہی اور پھر اس نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

"نہیں درندے"۔

یہ جواب پاکر بے چارے درندے نے ایک الم ناک آہ کھینچی جو ایک درد ناک چیخ معلوم ہوتی تھی۔ اور اس آواز سے تمام محل کانپ اٹھا۔ حسینہ سمجھی کہ اب اس کا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ مگر درندے نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

"شب بخیر حسینہ"۔

اور وہ دروازے کی طرف چل پڑا۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر حسینہ کو حسرت سے دیکھتا جاتا تھا۔ حسینہ تنہا رہ گئی تو اس نے اپنے دل میں رحم اور ترس کی لہر اٹھتی ہوئی محسوس کی۔

"افسوس کہ وہ اتنا مکروہ شکل ہے۔ مگر ساتھ ہی وہ کتنا رحم دل ہے۔"

حسینہ نے اپنے دل میں کہا۔

حسینہ نے محل میں رہتے ہوئے تین مہینے گزر گئے۔ اس دوران میں کوئی خاص واقعہ نہ ہوا۔ ہر شام درندہ حسینہ کو ملنے آتا اور اپنی سادہ باتوں سے حسینہ کو خوش کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کی گفتگو معقول ضرور ہوتی مگر اس میں تکلف اور چرب زبانی نہ تھی۔ جس کی تعریف تعلیم یافتہ لوگوں کی سوسائٹی میں کی جاتی ہے۔ ہر روز حسینہ اس نفرت انگیز اور مکروہ درندے میں رحم دلی اور نیکی کی کوئی نہ کوئی نئی علامت پاتی تھی۔ اور اس طرح وہ آہستہ آہستہ درندے سے روزانہ ملاقات کی عادی ہو گئی۔ اور اب ڈرنے کی بجائے اسے درندے

کا انتظار رہنے لگا۔ ہر شام وہ بار بار اپنی گھڑی دیکھتی تھی۔ کیونکہ شام کے نو بجے درندے کے آنے کا وقت تھا۔ بہر حال ایک چیز اسے خوف زدہ رکھتی تھی۔ ہر شام درندہ جانے سے پہلے حسینہ سے شادی کی درخواست ضرور کرتا۔ اور اس کے انکار سے درندے کو پہلے روز جتنا ہی دُکھ ہوتا تھا۔

ایک شام کو حسینہ نے درندے سے کہا۔

"درندے! روز تم مجھے پریشان کرتے ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم سے شادی کے لیے اپنے دل کو آمادہ کر لوں۔ مگر میں خود اپنی ذات سے اتنی دیانت دار ہوں۔ کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ تمھیں یہ ظاہر کر دینا شروع کر دوں کہ میں شادی کے لیے تیار ہوں۔ میں تمام عمر تمھاری دوست رہوں گی۔ کیا تم اس سے مطمئن نہیں ہو سکتے۔"

درندے نے سوچتے ہوئے کہا۔" میرا خیال ہے کہ مجھے اس سے مطمئن ہو جانا چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ میں کتنا خوف ناک اور مکروہ صورت ہوں۔ مگر مجھے تم سے بے پناہ محبت ہے۔ میں تمھارا بڑا شکر گزار ہوں کہ تم میرے پاس رہنے پر آمادہ ہو۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ تم مجھ سے یہ وعدہ کرو کہ تم مجھے چھوڑ کر کبھی نہ جاؤ گی۔"

حسینہ یہ الفاظ سن کر شرما گئی۔ اسی دوپہر کو اس نے آئینے میں دیکھا تھا۔ کہ اس کا والد اس کی جدائی میں بیمار پڑا ہے۔ اور اس کی زبردست خواہش تھی کہ وہ ایک بار اپنے ضعیف والد سے ملے اور اسے اپنی زندگی کا یقین دلائے۔

"میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمھیں کبھی نہ چھوڑوں گی۔ مگر میری خواہش ہے

کہ ایک بار، صرف ایک بار اپنے والد سے ملاقات کروں۔ اگر میں ان سے مل نہ سکی تو میں اس دُکھ سے مر جاؤں گی۔"

"آہ نہیں۔ تمھیں دُکھی دیکھنے کی بجائے میں جان دینا پسند کروں گا۔ میں تمھیں تمھارے والد کے گھر بھیج دوں گا تم وہاں اطمینان سے رہنا۔ اور یہاں یہ غریب درندہ تمھاری جُدائی میں جان دے دے گا۔"

"نہیں نہیں"۔ حسینہ نے روتے ہوئے کہا "میں تمھیں اتنا ضرور چاہتی ہوں کہ تمھاری موت کا سبب نہ بنوں گی۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ آٹھ روز کے بعد میں تمھارے پاس آجاؤں گی۔ تمھاری مہربانی سے یہ میں دیکھ چکی ہوں کہ میری دونوں بہنوں کی شادی ہو چکی ہے اور میرے تینوں بھائی فوج میں بھرتی ہو گئے ہیں۔ اب میرے والد گھر میں تنہا رہتے ہیں۔ مجھے ان کے پاس ایک ہفتہ گزارنے دو۔ میری تم سے التجا ہے۔"

کل صبح تم اپنے والد کے پاس پہنچ جاؤ گی۔ مگر اپنے وعدے کو بھولنا مت۔ جب تم واپس آنا چاہو تو سونے سے پہلے اپنی انگشتری میز پر رکھ دینا۔ شب بخیر حسینہ۔"

درندے نے یہ کہتے ہوئے بڑی خوف ناک آہ بھری۔ حسینہ کو بڑا ہی دُکھ ہوا۔ کہ اس کی وجہ سے درندے کو رنج پہنچا ہے۔

دوسری صبح حسینہ اپنے والد کے گھر میں تھی۔ اس کے پلنگ کے پاس ایک تپائی پر ایک گھنٹی پڑی تھی۔ اس نے گھنٹی اٹھا کر بجائی۔ آواز پر خادمہ بھاگتی ہوئی آئی۔ اور حسینہ کو دیکھ کر تعجّب اور حیرانگی سے اس کی چیخ نکل گئی۔

خادمہ کی چیخ سُن کر سوداگر بھی جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اور جب اس نے حسینہ کو دیکھا تو مارے خوشی کے دیوانہ سا ہوگیا۔ اور اس نے آگے بڑھ کر بڑے پیار سے حسینہ کو گلے سے لگالیا۔

حسینہ جب لباس تبدیل کرنے لگی تو اسے یاد آیا کہ اس کے کپڑے تو محل ہی میں رہ گئے ہیں۔ مگر عین اس وقت خادمہ نے اطلاع دی کہ دوسرے کمرے میں اس نے ایک نیا صندوق دیکھا ہے۔ صندوق کو کھولا گیا۔ تو اس میں بڑے قیمتی اور عمدہ لباس نکلے۔ ہر لباس پر سچّا کام کیا ہوا تھا۔ اور کناروں پر ہیرے اور پنّے لگے ہوئے تھے۔

یہ دیکھ کر حسینہ کا دل درندے کی اس مہربانی سے بڑا خوش ہوا۔ اس نے ان لباسوں میں سے ایک سادہ سا جوڑا چُنا۔ اور پھر ملازمہ سے کہا کہ صندوق کو تالا لگادے۔ کیونکہ دیگر پوشاکیں وہ اپنی بہنوں کو دینا چاہتی تھی۔ جونہی اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو صندوق غائب ہوگیا۔ یہ دیکھ کر اس کا والد بولا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ درندہ کو یہ گوارا نہیں کہ یہ لباس تمہارے سوا اور کوئی پہنے۔"

ابھی یہ الفاظ اس کی زبان ہی پر تھے۔ کہ صندوق پھر اسی جگہ پر آگیا۔ جب حسینہ لباس تبدیل کرنے لگی تو اس کے آنے کی اطلاع اس کی بہنوں کو کرائی گئی۔ اس کی بہنیں اپنے اپنے خاوند کے ہمراہ جلد ہی پہنچ گئیں۔ دونوں بہنیں بڑی دکھی تھیں۔ ایک کا خاوند بڑا خوبصورت تھا۔ مگر اتنا نکمّا اور کاہل تھا کہ بس ہر وقت اپنے حسن ہی پر اتراتا رہتا تھا۔ اور اپنی بیوی کو خاطر ہی میں

نہیں لاتا تھا۔ دوسری بہن کا خاوند بہت ہوشیار اور چالاک تھا۔ مگر اس کی تمام چالاکی دوسروں پر جلے کٹے فقرے کہنے ہی پر ختم ہوتی تھی۔ خاص طور پر وہ اپنی بیوی کو تختۂ مشق بناتا تھا۔

جب بہنوں نے دیکھا کہ حسینہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ حسین ہوگئی ہے۔ اور ایک شہزادی کی مانند آراستہ ہے تو مارے جلاپے کے راکھ ہوگئیں۔ حسینہ نے فضول ہی انھیں پیار سے گلے لگایا۔ وہ اپنے جلاپے کو چھپا نہ سکیں۔ جب انھیں یہ محسوس ہوا کہ حسینہ اپنی موجودہ زندگی سے بڑی مطمئن اور خوش ہے۔ تو ان کے غصّے اور نفرت کی انتہا نہ رہی۔ تھوڑی دیر بعد دونوں بہنیں باغیچے میں گئیں اور حسینہ کے خلاف زہر اُگل کر دل ٹھنڈا کرنے لگیں۔

"بدبخت حسینہ! آخر ہم سے زیادہ خوش کیوں ہے۔ کیا ہم خوشی کے حق دار ہی نہیں"۔ بڑی بہن نے کہا۔

"بہن!" چھوٹی بولی۔ "مجھے ایک ترکیب سوجھی ہے۔ ہم حسینہ کو یہ ترغیب دیں۔ کہ وہ آٹھ دن کے بجائے زیادہ دن ہمارے پاس رہے۔ اس طرح احمق درندہ اس کی وعدہ شکنی پر بہت غضب ناک ہوگا اور یقیناً اسے کھا جائے گا۔"

"یہ تو بہت ہی اچھی تجویز ہے۔ چلو ہم جا کر یہ ظاہر کریں کہ ہمیں حسینہ سے بے اندازہ محبّت ہے اور اس کی میٹھی میٹھی باتیں کرکے اس کا جی موہ لینا چاہیے"۔ بڑی بہن نے تائید کی۔

اس بُرے ارادے سے دونوں کٹیا میں داخل ہوئیں۔ اور حسینہ سے

اتنی نرمی سے پیش آنے لگیں اور اس سے اتنا پیار جتلایا کہ خوشی کے مارے حسینہ کے آنسو نکل آئے۔

آٹھویں روز بڑی بہنوں نے افسوس اور غم کا جھوٹا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے اپنے بال نوچ لیے اور رو رو کر اپنا بُرا حال کر لیا اور ہاتھ مَل مَل کر حسینہ کو چند دن اور رہنے کی التجا کرنے لگیں۔ آخر کار وہ مان گئی۔ کہ چند روز اور انہی بہنوں کے پاس رہے گی۔ مگر ساتھ ہی درندے کو مایوس کرنے کا اسے سخت رنج ہوُا۔ کیونکہ اب اسے درندے سے کچھ اُنس ہو گیا تھا۔

دسویں رات اس نے خواب میں دیکھا کہ محل کے باغ میں فوّارے کے پاس درندہ پڑا دم توڑ رہا ہے اور حسینہ کو وعدہ خلافی کے لیے کوس رہا ہے۔ گھبرا کر حسینہ کی آنکھ کھُل گئی۔

مَیں بھی کتنی بُری ہُوں۔ حسینہ نے سوچا۔ میں درندے کو خواہ مخواہ دُکھ پہنچا رہی ہوں۔ کیا یہ اس کا قصور ہے کہ وہ مکروہ شکل اور ہیبت ناک ہے۔ اور ہوشیار اور ذہین نہیں۔ وہ نیک دل ہے اور یہ وصف چالاکی اور خوب صورتی سے کہیں اعلیٰ ہے۔ آخر مَیں اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتی۔ مَیں درندے کی بیوی بن کر اپنی بہنوں سے یقیناً زیادہ خوشی سے زندگی بسر کروں گی۔ خاوند کی خوبصورتی اور ذہانت بیوی کو خوش نہیں کر سکتی۔ بلکہ نرم دلی، اخلاق اور شرافت ہی بیوی کو سچّی خوشی سے ہم کنار کر سکتی ہے۔ اور میرے درندے میں یہ تمام اوصاف موجود ہیں۔ یہ درست ہے کہ مجھے اس سے محبّت نہیں۔ مگر یہ بھی تو ہے کہ جب میں اس کا خیال کرتی ہوں۔ تو میرا دل

اس کی عزّت، دوستی اور ممنونیت کے جذبات سے معمور ہو جاتا ہے۔ مجھے اسے دُکھ نہیں دینا چاہیے۔ اگر مَیں نے اسے دیدہ دانستہ دُکھ پہنچایا تو پھر بھی اپنی تمام عمر تاسف کرتی رہوں گی۔

حسینہ اپنے بستر سے اٹھی اور اپنی انگوٹھی میز پر رکھ کر بستر پر لیٹ گئی۔ اسے نیند نے فوراً آ لیا۔ صبح جب اس کی آنکھ کُھلی تو وہ خود کو درندے کے محل میں پا کر بہت خوش ہوئی۔ اور درندے کو خوش کرنے کی غرض سے اس نے بڑی شاندار پوشاک زیب تن کی اور پھر رات کے نو بجے کا بے صبری سے انتظار کرنے لگی۔ اسے یہ دن بہت ہی طویل معلوم ہوتا تھا۔ آخر شدید انتظار کے بعد کلاک نے نو بجائے۔ لیکن درندے کا وہاں نام و نشان ظاہر نہ ہُوا۔

وہ بہت پریشان ہوئی۔ اسے یہ خوف بھی دامن گیر ہو گیا۔ کہ واقعی درندے کی موت نہ ہو گئی ہو۔ وہ اسے محل کے تمام کمروں میں پکارتی رہی۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ جب وہ نا امید ہونے لگی تو اسے رات کا خواب یاد آیا۔ وہ دَوڑتی ہوئی باغ میں پہنچی۔ جس طرح اس نے خواب میں دیکھا تھا۔ بعینہٖ درندہ فوّارے کے پاس بے ہوش پڑا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ یہ دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی اور وہ بے اختیار درندے کی چھاتی پر گر پڑی۔ اور جب اس نے محسوس کیا کہ درندے کے دل کی حرکت بند نہیں ہوئی تو وہ فوراً اٹھی اور فوّارے سے پانی لے کر اس کی کنپٹیوں پر لگایا۔ اس سے درندے کو کچھ افاقہ ہُوا اور چند لمحات کے بعد اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

"تم نے اپنا وعدہ فراموش کر دیا تھا؟" درندے نے حسینہ کے چہرے پر

نظریں گاڑتے ہوئے کہا "تجھے کھونے سے مجھے اتنا صدمہ ہوا کہ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ بھوکا پیاسا رہ کر جان دے دوں گا۔ خیر اب تمہیں دیکھ کر خوشی سے میری جان نکلے گی۔"

"نہیں نہیں میرے پیارے درندے! تم زندہ رہو گے"۔ حسینہ نے روتے ہوئے کہا۔ "تم میرے خاوند بننے کے لیے ضرور زندہ رہو گے۔ اس لمحے سے مَیں تمہاری بیوی ہوں۔ اپنے خیال میں مَیں تمہیں صرف ایک دوست سمجھتی رہی۔ مگر آج مجھے معلوم ہوا کہ تمہارے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتی۔"

جونہی حسینہ نے یہ الفاظ کہے تو تمام محل میں یک لخت چراغاں ہو گیا۔ خود بخود آتش بازی چھوٹنے لگی۔ اور ہر طرف سے موسیقی کی لہریں اٹھنے لگیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی خاص تقریب کا آغاز ہو رہا ہے۔

حسینہ نے اپنی نگاہیں محل کی طرف اٹھائیں۔ لیکن دوسرے لمحے پھر درندے کی طرف مڑی۔ جس کی زندگی کے لیے وہ بہت پریشان تھی۔ مگر وہ کہاں گیا؟ اور اس سب کا مطلب کیا ہے؟

اس کے سامنے ایک نہایت خوب رو شہزادہ جھکا ہوا تھا اور حسینہ کا شکریہ ادا کرتا رہا۔ کہ آخر کار آج جادو کا اثر زائل ہو گیا ہے۔ یہ حسین شہزادہ حسینہ کی توجہ کا مستحق تھا۔ مگر اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"میرا درندہ کہاں ہے؟"

"تم اپنے قدموں میں دیکھ رہی ہو"۔ شہزادے نے کہا۔ "ایک چڑیل نے مجھ پر جادو کر دیا تھا۔ اور مَیں درندے کی خوف ناک اور مکروہ شکل میں

بدل گیا۔ جب تک کوئی حسین کنواری اپنی مرضی سے مجھ سے شادی کرنے پر رضا مند نہ ہو۔ تب تک مجھے اس مکروہ صورت میں رہنا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے اپنی ذہانت سے بھی کام لینے کی اجازت نہ تھی۔ اس عرصے میں کئی ایک لڑکیوں سے میری ملاقات ہوئی۔ مگر حسینہ صرف تم ہی نے میری خوف ناک بد صورتی کے باوجود میرے نیک دل کو محسوس کیا۔ تمھارے قدموں پہ اپنا تاج و تخت نچھاور کرنے کے بعد بھی میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں پاتا کہ تمھارا شکریہ ادا کر سکوں۔"

حسینہ تو جیسے خواب دیکھ رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ شہزادے کی طرف بڑھایا۔ اور دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیے محل میں داخل ہوئے۔

حسینہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے ہال کمرے میں اپنا پیارا باپ اور بہنیں دیکھیں۔ ان کے پاس ایک حسین عورت بھی کھڑی تھی دراصل یہ پری تھی، جو حسینہ کے خواب میں بھی آ چکی تھی۔ اور اب اس نے حسینہ کے خاندان کو محل میں پہنچایا تھا۔ پری آگے بڑھی اور یوں گویا ہوئی۔

"حسینہ آؤ اپنے حُسنِ انتخاب کا انعام حاصل کرو۔ تم نے بہتر اخلاق کو حُسن اور چالاکی پر فوقیت دی ہے۔ اب تم مستحق ہو گئی ہو کہ سب اوصاف ایک نوجوان میں پاؤ۔ یہ نوجوان تمھارے پاس کھڑا ہے۔ یہ ایک شہزادہ ہے اور تم ایک وسیع سلطنت کی ملکہ بننے والی ہو۔ اور مجھے امید ہے کہ تخت و تاج تمھارے اخلاق کو بگاڑ نہ سکیں گے —— اور تم دونوں کا جہاں تک تعلق ہے پری حسینہ کی بہنوں سے کہنے لگی۔" میں جانتی ہوں کہ تمھارا دل نفرت اور

انتقام سے کیسے بھر جائے گا۔ اس لیے تم پتھّر کے مجسّمے بن جاؤ گی۔ مگر تمھاری سُوجھ بوجھ برقرار رہے گی۔ اور تمھارے لیے یہی سزا ہے کہ اپنی چھوٹی بہن کی خوشی کو دیکھتی رہو اور جلتی رہو۔ تمھارے مجسّمے محل کے صدر دروازے پر نصب کر دیے جائیں گے۔ جب تک تم اپنی بُرائی کو پہچان نہ لوگی، تب تک اس طرح مجسّمے بنی رہوگی۔ البتہ اگر تم نے اپنی بُرائیوں کو محسوس کر لیا۔ اور انھیں دُور کرنے کے لیے آمادہ ہوجاؤ، تو پھر تم اصل صورت میں آسکتی ہو۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ تم پتھر کا بُت ہی رہوگی۔ کیونکہ غرور، بدمزاجی اور طمع کو دور کیا جاسکتا ہے۔ مگر نفرت کرنے والا دل ٹھیک ہونا ایک معجزے سے کم نہیں"۔

پری نے اپنی طلسمی چھڑی سے انھیں چھُوا۔ اور دوسرے لمحے سب شہزادے ملک میں پہنچ گئے۔ رعایا شہزادے کو پاکر بہت خوش ہوئی۔ بڑی دھوم دھام سے حسینہ اور شہزادے کی شادی کی گئی۔ کئی روز تک دعوتوں کا سلسلہ جاری رہا۔

حسینہ اور شہزادہ باقی زندگی ایک دوسرے سے بے پناہ محبّت کرتے رہے۔

جرمنی

۱۔ تین بھائی
۲۔ نِکسی

جرمن من حیث القوم نظم و ضبط کے پابند اور شیدائی ہیں۔ اٹھارھویں صدی کے وسط میں جرمنی کے دو محققوں نے اپنے ملک کی تمام لوک کہانیوں کو چھبیس جلدوں میں جمع کیا۔ ایک ایک کہانی کے پانچ پانچ انداز سے محفوظ کیا گیا۔ یہ دو محقق گریم برادرز (GRIMM BROS) کے نام سے مشہور ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان کی توجہ اور کوشش سے لوک کہانیوں کو ان کی مستحق اہمیت حاصل ہوئی۔

تین بھائی اور نکسی دو مختلف کہانیاں ہیں جس سے موضوع اور انداز کے لحاظ سے جرمنی کے لوگوں کے رجحانات کا علم ہوتا ہے۔ یہ دونوں کہانیاں گریم برادرز کے مجموعے سے لی گئی ہیں۔

تین بھائی

ایک شخص کے تین بیٹے تھے۔ اور اُسے اُن سے یکساں محبّت تھی۔ اس شخص کے پاس صرف ایک ہی مکان تھا اور وہ یہ فیصلہ نہ کرسکتا تھا کہ مکان کا وارث کس کو بنائے۔ وہ کسی بیٹے سے خاص رعایت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ نہ ہی وہ مکان کو فروخت کر کے نقدی کو تین برابر حصّوں میں تقسیم کرنے کے لیے تیار تھا۔ کیونکہ یہ مکان کئی نسلوں سے خاندانی ملکیّت چلا آرہا تھا۔

آخر بڑی سوچ بچار کے بعد اسے ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے تینوں بیٹوں کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔

" تم تینوں اپنی اپنی منشا کے مطابق کوئی ہُنر سیکھو۔ جو اپنے ہُنر میں

کمال حاصل کرے گا یہ موروثی مکان اسی کا ہوگا۔"

تینوں بھائیوں کو یہ تجویز بڑی پسند آئی۔ بڑا لوہار، منجھلا حجام اور چھوٹا شمشیر زن بننے کا خواہش مند تھا۔ تینوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنا اپنا ہُنر سیکھ کر ایک ہی دن گھر واپس آئیں گے۔ اور پھر تینوں نے مختلف سمتوں کی راہ لی۔

اتفاق سے تینوں بھائیوں کو بڑے باکمال استاد ملے۔ اور ہر ایک اپنا اپنا ہُنر محنت سے سیکھنے لگا۔ کچھ عرصے بعد لوہار بھائی اتنا کامیاب ہُنر مند مشہور ہوگیا کہ بادشاہ کے خاص گھوڑے کے نعل اسی سے بندھوائے جانے لگے۔ اسے اب اپنی کامیابی سے پورا یقین ہوگیا کہ مکان کا حق دار وہی ہوگا۔

حجام بھائی نے بھی اتنا کمال اپنے ہنر میں حاصل کیا کہ شہر کے نامور لوگ اس سے حجامت بنوانے لگے اور اب اسے بھی اپنی ذات پر اتنا اعتماد ہوگیا کہ مکان کا مالک وہی ہوگا۔

شمشیر باز بھائی کو تلوار کے ہاتھ سیکھنے میں کئی زخم کھانے پڑے۔ لیکن وہ ہر زخم کے بعد دانت پیس کر اپنے آپ سے کہتا۔ "اگر تم ان زخموں سے جی چھوڑ گئے تو بھی مکان کے مالک نہیں ہو سکتے۔"

ایک مدت کے بعد مقررہ دن، تینوں بھائی اپنے گھر آپہنچے اور سوچنے لگے کہ ہم اپنے اپنے کمال کا مظاہرہ کیسے کریں۔ اتنے میں کھیت سے بھاگتا ہوا ایک خرگوش آتا ہوا انھیں نظر آیا۔

"دیکھو! یہ خرگوش عین موقعے پر نکل آیا ہے"۔ یہ کہتے ہوئے حجام بھائی نے پیالی اور صابن نکال کر برش سے اچھی طرح جھاگ بنالی۔ اور جب بھاگتا ہوا خرگوش ان کے پاس سے گزرنے لگا تو حجام نے خرگوش کی مونچھیں اس صفائی سے صاف کر دیں کہ نہ اس پر کوئی خراش آئی اور نہ ہی خرگوش پل بھر کے لیے رُکا۔

"بہت خوب! تم نے تو کمال کر دیا ہے"۔ اس کے والد نے کہا۔ "اگر تمھارے بھائی اس سے زیادہ کمالِ فن دکھا نہ سکے تو بس سمجھو مکان تمھارا ہے۔"

تھوڑی دیر کے بعد ایک بگھی بڑی تیزی سے ادھر آ نکلی۔

"اب میں آپ کو اپنا کمال دکھاتا ہوں" لوہار بھائی نے کہا۔ اور ساتھ ہی اُچک کر بھاگتی ہوئی بگھی پر سوار ہو گیا اور سرپٹ دَوڑتے ہوئے گھوڑے کی چاروں نعلیں اُکھیڑ کر نئی نعلیں لگا دیں۔ اس دوران میں مجال ہے جو گھوڑے کی رفتار ذرا بھی سُست ہوئی ہو۔"

"واقعی تم بہت ہوشیار ہو"۔ باپ نے کہا۔ "تم بھی اپنے بھائی کی مانند اپنے ہنر میں طاق ہو۔ مگر اب میں یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ تم دونوں میں سے کسے مکان کا وارث بناؤں۔"

"ابّا مجھے بھی کچھ دکھانے کی اجازت دیجیے"۔ شمشیر باز نے کہا۔

اتنے میں ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی۔ شمشیر باز نے اپنی تلوار نکالی۔ اور اسے اپنے سر کے اوپر یوں گھمانے لگا کہ اس کے جسم پر ایک قطرہ بھی نہ گر سکا۔ بارش تیز سے تیز تر ہوتی گئی اور وہ بڑے زور سے تلوار

چلاتا رہا۔ اور اس دوران میں پانی کی ایک بوند بھی اس کے اُوپر نہ پڑی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک چھاتے کے نیچے کھڑا ہے۔

ان کا والد یہ دیکھ کر بڑا متعجب ہوا اور کہا "تم سب سے بازی لے گئے ہو۔ مکان تمھارا ہے۔"

شمشیر باز کے دونوں بھائی اس کا یہ کمال دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور اپنے بھائی کی خوب جی کھول کر تعریف کرنے لگے۔ چونکہ انھیں ایک دوسرے سے بے حد محبت تھی۔ اس لیے انھوں نے مکان میں اکٹھے رہنے کا فیصلہ کیا اور پھر تینوں بھائیوں نے اپنا اپنا پیشہ شروع کر دیا۔ چند دنوں ہی میں ان کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی۔ اس طرح انھوں نے خوب دولت کمائی اور بڑے مزے کی زندگی بسر کرتے رہے۔ جب وہ بوڑھے ہو گئے تو ان میں سے ایک بھائی اچانک بیمار ہو گیا اور چند روز کے بعد انتقال کر گیا۔ بھائی کی موت پر دونوں بھائیوں کو بڑا ہی افسوس ہوا۔ اور اس غم میں وہ بھی جلد ہی مر گئے۔ چونکہ وہ تینوں باکمال ہنرمند تھے۔ اور ایک دوسرے سے والہانہ محبت کرتے تھے۔ اس لیے لوگوں نے انھیں ایک ہی قبر میں دفنا دیا۔

نِکسی

مدّت گزری کہ ایک پن چکّی کا مالک جو مال و اسباب میں مشہور تھا اور جس کی تمام ضروریات پوری ہونے کے بعد بھی دولت اس کے پاس رہتی تھی۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ مصیبت رات کی تاریکی کی مانند آتی ہے۔ اچانک یہ شخص مفلس و قلاش ہو گیا۔ اب وہ اپنی پن چکّی کو بھی مشکل ہی سے اپنی ملکیت کہہ سکتا تھا۔ وہ سارا سارا دن مایوسی اور ناامیدی میں سرگرداں پھرتا رہتا۔ جب رات کو وہ بستر پر لیٹتا تو ساری رات مغموم خیالات میں کھویا رہتا۔

ایک روز وہ مُنہ اندھیرے اپنے بستر سے باہر گیا۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ کھُلی ہوا میں اس کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گا۔ وہ پن چکّی کے پچھواڑے

تالاب کے کنارے ٹہل رہا تھا کہ اس نے پانی میں ایک عجیب آواز سنی۔ قریب ہو کر دیکھا تو تالاب کی بے تاب لہروں میں سے ایک عورت نمودار ہوئی۔ اسے پہلی نظر ہی سے معلوم ہو گیا کہ یہ تالاب کی نکسی کے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ ساتھ ہی اس پر اتنی زبردست ہیبت چھائی کہ وہ سکتے کے عالم میں کھڑا رہا اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ وہاں کھڑا رہے یا بھاگ جائے۔ وہ اسی عالم میں کھڑا تھا کہ نکسی نے اس کا نام لے کر پکارا اور پوچھا کہ وہ اتنا دکھی کیوں ہے؟

جب اس نے سنا کہ نکسی کا لہجہ دوستانہ ہے تو اس نے جی کڑا کر کے بتایا کہ وہ اپنی تمام زندگی میں مالدار اور فارغ البال رہا ہے۔ لیکن اب اس کا ہاتھ اتنا تنگ ہو چکا ہے کہ اسے کچھ سوجھائی نہیں دیتا۔

نکسی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ کہ وہ اسے اتنا دولت مند بنا دے گی۔ جتنا کہ وہ پہلے نہیں تھا۔ بشرطیکہ وہ اپنے گھر کی سب سے چھوٹی جاندار شئے بدل میں دے دے۔

اس نے سوچا کہ نکسی کی مراد کتے یا بلی کے ننھے بچوں سے ہے۔ اس لیے اس نے نکسی سے وعدہ کر لیا اور بن چکی میں پُر اُمید واپس آگیا۔ گھر کی دہلیز پر ہی اسے خوش خبری دی گئی۔ کہ اس کی بیوی کے لڑکا ہوا ہے۔ یہ سُن کر وہ بڑا پریشان ہوا۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ اپنی بیوی اور اس کے رشتہ داروں کے پاس گیا اور اس نے انھیں بتایا کہ اس نے ابھی ابھی نکسی سے کتنا خوف ناک معاملہ طے کیا ہے۔

نکسی نے مجھے جو دولت دینے کا وعدہ کیا ہے، میں اس دولت کو دے

سکتا ہوں ۔ اگر میں اپنے بچے کی جان بچا سکوں"۔ لیکن اسے کوئی مشورہ دینے کے متعلق کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ بچے کو کسی صورت میں بھی تالاب کے پاس نہ جانے دیا جائے۔

بچہ بخیر و عافیت جوان ہوا۔ اس زمانے میں پن چکی کا مالک پہلے سے بھی زیادہ مالدار ہو گیا۔ لیکن وہ اس امارت سے کوئی خوشی حاصل نہیں کر سکا۔ اسے نکسی سے اپنا وعدہ یاد تھا۔ اور ہر وقت اسے دھڑکا لگا رہتا تھا کہ وہ وعدہ پورا کرانے کا مطالبہ کرے گی۔

کئی سال گزر گئے۔ لڑکا جوان ہو کر نامور شکاری نکلا۔ مقامی جاگیردار نے اسے اپنے ہاں ملازم رکھ لیا۔ کیونکہ وہ اتنا ہوشیار اور بہادر شکاری تھا جتنا کہ ہم دیکھنے کی تمنا کر سکتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد اس نے ایک حسین لڑکی سے شادی کر لی اور ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگا۔

ایک روز وہ شکار کھیل رہا تھا۔ کہ ایک خرگوش اس کے پاؤں کے قریب اچھلا۔ اور اس کے سامنے کھلے کھیت میں بھاگنے لگا۔ شکاری اس کا تعاقب کرنے لگا۔ آخر اسے مار گرایا۔ اسی جگہ اس نے خرگوش کی کھال اتارنا شروع کر دی اور اسے دھیان ہی نہ رہا کہ وہ پن چکی کے پچھواڑے تالاب میں پہنچ چکا ہے۔ جس کے متعلق اسے بچپن ہی سے ذہن نشین کرایا گیا تھا کہ وہ اس سے ہمیشہ دور رہے۔ اس نے جب خرگوش کی کھال اتار لی تو اپنے خون آلودہ ہاتھ صاف کرنے کے لیے تالاب میں جھکا۔ ابھی اس نے پانی کو چھوا ہی تھا کہ نکسی پانی سے ابھری اور اسے اپنے گیلے بازوؤں میں لے کر تالاب کی لہروں

میں گم ہو گئی۔

شام کو شکاری گھر نہ پہنچا۔ تو اس کی بیوی بڑی پریشان ہوئی۔ اسے تلاش کرتی ہوئی اس تالاب کے پاس پہنچی۔ اپنے خاوند کا شکاری تھیلا دیکھ کر اسے معلوم ہو گیا کہ شکاری پر کیا بیتی ہے۔ وہ دکھ اور غم سے نڈھال ہو گئی۔ اور تالاب کے گرد چکر لگاتے ہوئے اپنے خاوند کو پکارنے لگی۔ لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا۔ آخر کار تھک ہار کر وہیں بیٹھ گئی اور اسے جلد ہی نیند آ گئی۔

اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک خوش نما سبزہ زار میں وہ جا رہی ہے۔ اور سبزہ زار کے آخری کنارے پر ایک کٹیا ہے۔ وہ اس کٹیا میں داخل ہوتی ہے۔ وہاں ایک بڑھیا جادوگرنی ایسے ملتی ہے جو اس سے وعدہ کرتی ہے کہ اس کا خاوند اسے واپس دلائے گی۔

جب وہ بیدار ہوئی۔ تو اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اس جادوگرنی کو ضرور تلاش کرے گی۔ اور وہ اس کی تلاش میں ماری ماری پھرتی رہی۔ آخر اسے وہ سبزہ زار مل گیا جو اس نے خواب میں دیکھا تھا۔ اس کے کنارے کٹیا بھی موجود تھی۔ وہ کٹیا میں گئی اور اس نے جادوگرنی سے تمام واقعہ کہہ سنایا۔

جادوگرنی نے اس سے مدد کا وعدہ کیا اور اسے مشورہ دیا۔ چاند کی چودھویں رات کو تالاب پر جائے۔ کنارے پر بیٹھ کر سنہری کنگھے سے اپنے کالے بال سنوارے۔ شکاری کی بیوی نے جادوگرنی کو ایک قیمتی تحفہ دیا اور اس کا شکریہ ادا کر کے اپنے گھر واپس آ گئی۔

چودھویں کے چاند تک وقت بڑی مشکل سے گزرتا رہا۔ جب وہ رات

آئی تو شکاری کی بیوی تالاب پر پہنچی اور اپنے سیاہ بالوں میں کنگھی کرنے لگی اور جب اس نے اپنے بال سنوار لیے تو کنگھی کو کنارے پر رکھ دیا۔ پھر وہ پانی کو بڑی بے تابی سے دیکھنے لگی۔ اس نے پانی میں ایک آواز سنی اور ساتھ ہی بڑی بڑی لہریں اٹھیں اور وہ کنگھی کو تالاب میں لے گئیں اور ایک لمحہ کے بعد اس کے خاوند کا سر پانی سے اُبھرا اور وہ بڑی حسرت سے اسے دیکھنے لگا۔ لیکن فوراً دوسری لہر اٹھی اور اس نے سر کو پانی میں غرق کر دیا۔ یہ اتنی جلدی ہوا کہ وہ بے چارہ ایک لفظ بھی اپنی بیوی سے نہیں کہہ سکا۔ تالاب چاندنی میں ساکن و جامد نظر آ رہا تھا۔ اور شکاری کی بیوی پہلے کی طرح اسی طرح بے نیل و مرام کھڑی تھی۔

مایوسی اور ناامیدی میں وہ دن رات ماری ماری پھرتی رہی۔ اور جب وہ تھک ہار کر سو گئی تو اس نے بعینہٖ وہی خواب دیکھا۔ بیدار ہو کر وہ اس بڑھیا کے پاس پہنچی۔ اس بار اس نے مشورہ دیا کہ چاند کی چودھویں رات سونے کی بنسری بجائے۔ اور پھر اس بنسری کو تالاب کے کنارے رکھ دے۔

جب پورا چاند طلوع ہوا تو شکاری کی بیوی نے سونے کی بنسری بجائی۔ اور پھر تالاب کے کنارے رکھ کر انتظار کرنے لگی۔ پھر تالاب سے ایک زور کی لہر اٹھی اور بنسری کو بہا لے گئی۔ دوسرے لمحے اس کا خاوند لہروں سے بلند ہونا شروع ہوا۔ اور وہ حسرت سے اپنی بیوی کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کا دھڑ پانی کے باہر نکلا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی بیوی کی طرف اٹھائے لیکن ساتھ ہی زبردست لہریں اٹھیں اور اسے پانی میں غرق کر دیا۔ شکاری

کی بیوی اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے خاوند کو دوسری مرتبہ غرق ہوتے دیکھ کر بہت ہی افسردہ ہوئی۔

لیکن تیسری مرتبہ پھر وہی خواب آیا۔ اور وہ جادوگرنی کے پاس گئی۔ اس بار جادوگرنی نے اس سے کہا کہ چاند کی چودھویں رات کو تالاب پر جائے اور سنہرے چرخہ پر سُوت کاتے اور اسے کنارے پر رکھ کر نتائج کی منتظر رہے۔

شکاری کی بیوی نے ایسا ہی کیا۔ چودھویں کی چاندنی میں تالاب پر گئی اور وہاں سنہرا چرخہ کاتنے لگی۔ جب اس نے چرخہ تالاب کے کنارے رکھا تو تھوڑی دیر بعد تالاب سے زور کی لہر اٹھی اور چرخے کو بہا کر لے گئی۔ دوسرے لمحے اس کا خاوند پانی سے اُبھرنے لگا اور کنارے پر قدم رکھا اور اپنی بیوی سے بغل گیر ہوا۔ ابھی انھوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ کہ تالاب میں زبردست طوفان پیدا ہوا اور پانی کناروں سے باہر پھیل گیا اور دونوں کو تالاب میں بہا لے گیا۔ ان کی مایوسی کی انتہا نہ رہی۔ جب کہ دونوں مینڈک اور مینڈکی میں بدل گئے۔ لیکن انھیں اکٹھے رہنے نہیں دیا گیا۔ پانی کے بہاؤ نے انھیں الگ کر دیا۔ جب لہریں ختم ہوئیں تو وہ اپنی اصل صورت میں آ گئے۔ لیکن دونوں نے اپنے آپ کو ایک عجیب ملک میں پایا۔

شکاری گڈریا ہو گیا اور اس کی بیوی بھی چرواہن ہو گئی۔ اس طرح کئی سال تنہائی اور مایوسی میں گزر گئے۔

شکاری گڈریا اس ملک میں آیا جہاں چرواہن رہتی تھی۔ اسے جگہ بڑی پسند آئی۔ کیونکہ یہاں چراگاہیں بڑی عمدہ تھیں۔ چنانچہ اس نے

یہاں سکونت اختیار کرلی۔

دونوں چراگاہ میں ملے۔لیکن وہ ایک دوسرے کو پہچان نہ سکے۔البتہ وہ دونوں دوست بن گئے۔ایک رات جب کہ چودھویں کی چاندنی میں گڈریا بیٹھا اپنی بنسری بجا رہا تھا اور پاس ہی چرواہن بیٹھی ہوئی تھی۔بنسری سُن کر چرواہن کو وہ رات یاد آگئی۔جب کہ اس کا خاوند اس سے مل کر بچھڑ گیا تھا۔اس یاد سے اس کا دل بھر آیا اور وہ رونے لگی۔گڈریے نے بڑے اصرار کے بعد رونے کا سبب پوچھا۔آخر اس نے تمام واقعہ کہہ سنایا۔گڈریے کی آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا۔اور اس نے اپنی بیوی کو پہچان لیا۔اس طرح چرواہن نے بھی اپنے خاوند کو پہچان لیا۔پھر دونوں ہنسی خوشی اپنے گھر پہنچے اور کئی سال تک خوشی کی زندگی بسر کرتے رہے۔

بوہیمیا

عقل اور قسمت

بوہیمیا پہلی جنگِ عظیم سے قبل سلطنت آسٹریا کا ایک حصّہ تھا۔ اس علاقے پر وسط یورپ خصوصاً سلاو (SALAU) کلچر کا اثر موجود ہے۔ عقل اور قسمت اس علاقے کی بہت پیاری کہانی ہے۔ اور اسے بوہیمیا کی بہترین کہانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ عقل اور قسمت، تدبیر و تقدیر میں ازل سے جنگ جاری ہے۔ اور مجبور انسان ہمیشہ قسمت کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ یہ اس لوک کہانی کا مرکزی تخیّل ہے۔

اور یورپ کو قسمت کی اٹل قوت پر یقین مشرقی اذہان کے قریب تر لاتا ہے۔ اس تخیل پر کئی کہانیاں مشرق میں مشہور ہیں۔ اور آج کے ادیب کا بھی یہ پسندیدہ موضوع ہے۔ اور کون کہہ سکتا ہے۔ کہ بنی نوع انسان کو "عقل" تباہی اور موت کے دہانے پر لے آئی ہے۔ وہاں اس کی قسمت یاوری کرے گی اور اسے دینک کی طرح بچالے گی یا اس کی تباہی کا تماشہ دیکھے گی۔

عقل اور قسمت

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ قسمت باغ میں بینچ پر بیٹھی تھی کہ اتنے میں وہاں عقل آنکلی اور عقل نے قسمت سے کہا "میرے لیے جگہ خالی کردو"۔ اس زمانے میں عقل اتنی تجربہ کار نہ ہوئی تھی اور نہ اسے معلوم تھا کہ کس کے لیے جگہ خالی کرنی چاہیے اور کیوں؟

"میں تمھارے لیے جگہ خالی کردوں۔ آخر کیوں؟ مَیں تم سے کس لحاظ سے کم ہوں؟ قسمت نے تنک کر کہا "بہتر اور عالی مرتبہ وہی سمجھا جاتا ہے جس کے کارنامے زیادہ ہوں۔ بحث سے کیا فائدہ؟ وہ دیکھو سامنے کھیت میں کسان کا بیٹا ہل چلا رہا ہے۔ جاؤ اس میں داخل ہو جاؤ۔ اگر تم اسے زندگی میں کامیاب کردو تو مَیں ہمیشہ کے لیے تمھاری تابع ہو جاؤں گی۔ جب اور جہاں بھی تمھارا

سامنا ہوا تو ندامت سے اپنا سر نیچے کر کے تمہارا راستہ چھوڑ دوں گی۔"

عقل نے قسمت کی یہ تجویز منظور کر لی۔ اور جا کر کسان کے لڑکے میں داخل ہو گئی۔

جونہی کسان کے بیٹے نے یہ محسوس کیا کہ اس کے سر میں عقل سما گئی ہے تو اس نے سوچنا شروع کر دیا۔ کہ آخر میں اپنی تمام زندگی ہل چلانے میں ضائع کیوں کروں۔ جب کہ میں اس سے بہتر زندگی بسر کرنے کا اہل ہوں۔" یہ سوچنے کے بعد اس نے ہل کو وہیں چھوڑا اور گھر کی راہ لی۔

"ابا میں دہقان کی زندگی بسر نہیں کرتا۔ میں باغبانی سیکھنا چاہتا ہوں"۔ اس نے اپنے والد سے کہا۔

"کیا بک رہے ہو؟ عقل کے پیچھے لٹھ لیے کیوں پھرتے ہو ——" اتنا کہنے کے بعد کسان کو کچھ خیال آیا۔ اور کچھ وقفے کے بعد بولا۔

"خیر اگر تمہارا یہ قطعی فیصلہ ہے تو پھر باغبانی سیکھ لو۔ خدا تمہاری مدد کرے۔ ہاں میری موت کے بعد اس کٹیا کا مالک تمہارا بھائی ہوگا۔"

اس طرح وینک کے ہاتھ سے کٹیا بھی جاتی رہی۔ مگر اسے مطلقاً افسوس نہ ہوا۔ اور وہ سیدھا شاہی محلات کے مالی کے پاس پہنچا اور اس کا شاگرد ہو گیا۔

شاہی مالی اسے معمولی کام کرنے کو دیتا۔ مگر یہ اُس سے بہتر اور زیادہ کام کر کے دکھاتا۔ اور کچھ عرصے کے بعد اس نے مالی کی ہدایات پر عمل کرنا بھی چھوڑ دیا۔ بلکہ ہر کام اپنی منشا اور سوچ کے مطابق کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر

مالی کو غصہ تو بڑا آتا۔ مگر وینک کے سلیقے اور ہنر مندی کے پیشِ نظر خاموش رہتا۔ ایک روز شاہی مالی نے وینک سے کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے کہیں زیادہ عقل مند ہو۔ اور اس کے بعد مالی نے اسے مزید ہدایات دینا ترک کر دیا۔ اور اب وینک کو ہر طرح کی آزادی مل گئی۔

کچھ عرصے بعد وینک نے شاہی باغ کو اتنا خوش نما اور پیارا بنا دیا کہ بادشاہ اپنے آراستہ باغ کو دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ اور ہر صبح و شام اپنی ملکہ اور اکلوتی بیٹی کے ہمراہ باغ میں چہل قدمی کرنے آتا۔

شہزادی بڑی حسین، بڑی پیاری اور بہت ہی اچھّی تھی۔ پر افسوس ناک بات یہ تھی۔ کہ بارہ سال کی عمر کے بعد اس نے بولنا چھوڑ دیا اور پھر کسی نے اسے باتیں کرتے بھی نہیں سُنا۔ بادشاہ اپنی اکلوتی بیٹی کے اس دُکھ سے بڑا افسردہ رہتا تھا۔ اس نے لاکھوں جتن کیے مگر شاہزادی کی زبان پر جو تالا پڑا تھا وہ کھل نہ سکا۔ آخر اس نے اپنی سلطنت میں اعلان کروا دیا کہ جو شخص شہزادی کا گُنگ دُور کرے گا اس سے شہزادی کی شادی کی جائے گی۔

اس اعلان کے بعد کئی جوان بادشاہ، خوبصورت اور ذہین شہزادے اور بڑے بڑے نامور سپہ سالار بادشاہ کے دربار میں قسمت آزمائی کے لیے آئے۔ مگر جیسے آئے تھے ویسے ہی لَوٹ گئے۔ کوئی بھی شہزادی کی زبان کھولنے میں کامیاب نہ ہوا۔

"کیوں نہ میں کوشش کر دیکھوں؟ کون جانتا ہے کہ شاید شہزادی میرے

سوال کا جواب دے دے"۔ وینک یہ سوچ کر دربار میں حاضر ہوا۔ اور اپنا مدعا بیان کیا۔ بادشاہ اور اس کے مشیر وینک کے ہمراہ شہزادی کے کمرے میں پہنچے۔

شہزادی کے پاس ایک ننھا کتا تھا۔ جسے وہ بہت پیار کرتی تھی۔ یہ بڑا ہوشیار اور سمجھ دار جانور تھا۔ شہزادی کا معمولی اشارہ بھی سمجھ لیتا تھا۔ کمرے میں جب وینک بادشاہ اور اس کے مشیروں کے ساتھ داخل ہوا، تو اس نے ظاہر کیا کہ اس نے گویا شہزادی کو دیکھا ہی نہیں۔ اور فوراً کتے سے یوں مخاطب ہوا۔

" پلو میں نے سنا ہے کہ تم بڑے ہوشیار ہو اور ذہین ہو۔ میں تم سے ایک مشورہ لینا چاہتا ہوں۔ سنو۔ ایک سفر میں ہم تین ساتھی تھے۔ ایک بت تراش، دوسرا درزی اور تیسرا میں۔ ہم ایک گھنے جنگل سے گزر رہے تھے کہ ہمیں رات نے آ لیا اور مجبوراً ہمیں وہیں رات بسر کرنا پڑی۔ درندوں کے خوف سے ہم نے آگ کا بہت بڑا الاؤ جلایا اور آپس میں طے پایا کہ رات بھر ہر ایک باری باری پہرہ دے۔ پہلی باری بت تراش کی تھی۔ وقت گزارنے کے لیے وہ درخت کے ایک تنے سے نوجوان لڑکی کا مجسمہ تراشنے بیٹھ گیا۔ جب اس نے مجسمہ تراش لیا۔ تو اس نے درزی کو بیدار کیا۔ کیونکہ دوسری باری درزی کی تھی۔ درزی نے جب لڑکی کا مجسمہ دیکھا تو بت تراش سے پوچھا بھئی اس کا مطلب؟

"جب میں نے دیکھا کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے وقت گزرنا محال ہے تو میں نے یہ مجسمہ بنانا شروع کر دیا۔ اب مجسمہ تیار ہے۔ اگر تم بھی بیٹھے بیٹھے اکتا

جاؤ تو اسے لباس پہنا دو۔" بُت تراش یہ کہہ کر سو گیا۔ درزی نے قینچی، سُوئی اور دھاگا نکالا اور مجسمے کے لیے لباس تیار کرنے بیٹھ گیا۔ لباس سِل چکا تو لڑکی کے مجسمے کو پہنایا۔ اور مجھے آواز دی۔ اب میری باری تھی۔ جب میری نظر مجسمے پر پڑی تو مَیں نے اس سے دریافت کیا کہ یہ کیا ہے؟

"بُت تراش نے آسانی سے وقت کاٹنے کی غرض سے لڑکی کا مجسّمہ تیار کیا۔ اور میں نے اسے لباس پہنا دیا ہے۔ اگر تم بھی آسانی سے اپنا وقت گزارنا چاہتے ہو تو اسے بولنا سکھا دو۔"

واقعی میں نے لڑکی کے مجسمے کو بولنا سکھا دیا۔ صبح جب میرے ساتھی اٹھے تو دونوں نے لڑکی پر اپنا حق ثابت کرنے کی کوشش کی۔

"مَیں نے اسے تراشا ہے"۔ بُت تراش بولا۔

"میں نے اسے لباس پہنایا ہے"۔ درزی نے کہا

کتّے نے تو کیا جواب دینا تھا۔ شہزادی فوراً بول اٹھی "تم ہی لڑکی کے اصل حق دار ہو۔ بُت تراش کا بے جان مجسمہ کس کام کا اور درزی کے لباس کا کیا فائدہ؟ تم نے اسے زبان اور زندگی دی اس لیے لڑکی پر تمھارا حق مقدّم ہے۔

"آپ نے اپنا فیصلہ خود ہی سنا دیا" وینک نے خوشی سے کہا "میں نے آپ کو زبان اور نئی زندگی دی ہے۔ اس لیے آپ میری ہیں۔"

یہ سُن کر بادشاہ کا ایک مشیر بولا۔ "جہاں پناہ! تمھیں انعام واکرام سے مالا مال کر دیں گے۔ کیونکہ تم شہزادی کی زبان کھولنے میں کامیاب رہے ہو۔

چونکہ تم نیچ ذات سے تعلق رکھتے ہو، اس لیے شہزادی تمھاری بیوی نہیں ہو سکتی۔"
مگر وینک نے مشیر کی ان باتوں کی طرف توجہ ہی نہ دی۔
"ہاں تم نیچ ذات سے تعلق رکھتے ہو۔ بادولت اپنی بیٹی کی شادی تم سے نہیں کر سکتے۔ اس کی بجائے تمھیں بے اندازہ انعام دیا جائے گا" بادشاہ نے کہا۔

وینک نے انعام کی طرف کوئی دھیان نہ دیا اور کہنے لگا۔
"بادشاہ سلامت نے بغیر کسی شرط کے یہ وعدہ کیا تھا کہ جو کوئی بھی ان کی بیٹی کی زبان کھولے گا، اسی شخص سے شہزادی کی شادی ہوگی۔ بادشاہ کے الفاظ قانون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر بادشاہ سلامت یہ چاہتے ہیں کہ ان کے قانون کو دوسرے بھی تسلیم کریں تو سب سے پہلے انھیں اپنے قانون کو تسلیم کرتے ہوئے اس پر عمل کرنا چاہیے۔ اس لیے اصولاً جہاں پناہ کو اپنی بیٹی کی شادی ضرور کرنا چاہیے۔"
"اس کی مشکیں کس دو" دوسرا مشیر چلّایا۔ "جو شخص یہ کہتا ہے کہ بادشاہ کو یہ ضرور کرنا چاہیے۔ وہ بادشاہ سلامت کی بے حرمتی کے جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اور وہ اس قابل ہے کہ اس کی گردن فوراً مار دی جائے۔
"ٹھیک ہے مجرم کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔" بادشاہ نے حکم دے دیا۔

وینک کو شہر کے باہر قتل کے لیے لے جایا گیا۔ جب وینک مقتل پہنچا، تو قسمت کھڑی انتظار کر رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے عقل سے کہا۔

"دیکھ لیا نا! وینک کو کہاں تک لے آئی ہو۔ تمھاری مہربانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب اس کا سر اُڑایا جا رہا ہے۔ باہر نکلو اور مجھے آنے دو۔"

جونہی قسمت وینک میں داخل ہوئی۔ تو جلاّد کی تلوار وینک کی گردن کے بجائے لکڑی پر پڑی اور تلوار کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تلوار کو پکڑ کر کسی نے دو ٹکڑے کر دیے ہیں۔ ابھی جلاّد کے لیے دوسری تلوار لائی جا رہی تھی کہ شہر کی سمت سے ایک شاہی اعلانچی طوطی بجاتا اور سفید جھنڈی ہلاتا سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے پر نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے شاہی گاڑی گرد اُڑاتی ہوئی آ رہی تھی۔

یکایک اس تبدیلی کی وجہ یہ تھی کہ شہزادی نے بادشاہ کو سمجھایا۔ کہ وینک سچ کہتا ہے کہ بادشاہ کو وعدہ خلافی نہ کرنا چاہیے۔ اگر وینک پنچ ذات کا ہے تو اسے وہ بڑی آسانی سے شہزادے کا اعزاز بخش سکتا ہے۔ بادشاہ نے شہزادی کی بات تسلیم کر لی۔ اور حکم دیا کہ وینک کو واپس محل میں لایا جائے اور اسے شہزادے کا اعزاز دیا جائے۔ اور اس وقت خاص شاہی گاڑی وینک کو قتل گاہ سے لانے کے لیے روانہ کی گئی۔

وینک کی بجائے بادشاہ کے مشیروں کو قتل کر دیا گیا۔ جنھوں نے وینک کی گردن مارنے کا مشورہ دیا تھا

چند دن کے بعد اسی گاڑی میں وینک اور شہزادی کی شادی کا جلوس نکلا۔ عقل بھی تماشائیوں میں کھڑی جلوس دیکھ رہی تھی۔ یہ سوچتے ہوئے کہ قسمت اسے کہیں دیکھ نہ لے۔ اس نے فوراً اپنا سر جھکا لیا۔ اور وہاں

سے ہٹ گئی ۔ جیسے کہ اس پر تخ پانی پھینکا گیا ہو ۔
کہا جاتا ہے کہ اس روز سے عقل قسمت کو دیکھ کر پیچھے ہٹ جاتی ہے ۔

ڈنمارک

نیکی کا بدلہ

ڈنمارک کے لوگ جفاکش اور حقیقت پسند ہیں۔ ان کے ادب و فن میں یہ خصوصیت موجود ہے۔

یہ کہانی نیکی اور بدی اور اجر و سزا کے ابدی سوال پر اٹھائی گئی ہے۔ اس کہانی میں سانپ دانش ور اور موقع شناس دکھایا گیا ہے۔ لیکن لومڑ جو فریب اور دھوکے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ لالچ کی بنا پر موت کی نیند سو گیا۔ بہرکیف نیکی کر اور دریا میں ڈال کے مصداق نیکی کا کوئی انعام نہیں۔ نیکی بذاتِ خود ایک عمل ہے۔ جو مختلف صورتوں میں مختلف روپ لیتی ہے۔ کہیں کسی کے لیے سودمند کسی کے لیے نقصان دہ۔

یہ کہانی تقریباً تین سو سال پرانی بتائی جاتی ہے۔

نیکی کا بدلہ

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک کسان جنگل میں لکڑیاں کاٹنے گیا۔ اس نے کئی ایسے درخت دیکھے جو کچھ عرصے کے بعد بڑے تن آور نکل سکتے اور ان سے بڑی بڑی شہتیریاں نکل سکتی تھیں۔ ایسے درختوں کو وہ چھوڑتا ہوا کافی دُور نکل گیا۔ آخر اس نے ایک ایسا درخت دیکھا جو اس کے کام کے لیے موزوں تھا۔ اس کی خشک شاخیں آپس میں جُڑی ہوئی تھیں اور اس کا تنا کھوکھلا ہو چکا تھا۔ کسان نے اسے کاٹنا شروع کیا۔ اتنے میں اسے آواز آئی۔

"مدد۔ مدد کرو بھلے آدمی! مجھے آزاد کراؤ۔"

کسان نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی کہ کون اسے مدد کے لیے پکار رہا ہے۔ اس کی نظر ایک سانپ پر پڑی جو درخت کے پھٹے ہوئے تنے میں بُری طرح

پھنسا ہوا تھا۔

"نہیں۔ مَیں تمھاری مدد نہیں کروں گا۔ کیونکہ تم مجھے ڈس لو گے"۔ کسان نے سانپ کو جواب دیا۔

"سانپ نے اسے یقین دلایا کہ اگر وہ اسے آزاد کرا دے گا تو وہ اسے ہرگز نہیں کاٹے گا۔"

کسان کو یقین آگیا۔ اور اس نے اپنی کلہاڑی سے تنے کی دراڑ میں پھنسائی دراڑ زیادہ کھُل گئی اور سانپ آزاد ہوگیا۔ آزاد ہوتے ہی کلہاڑی کے دستے سے ہوتا ہوا آناً فاناً کسان کی گردن کے گرد لپٹ گیا اور اسے ڈسنے کے لیے اپنا پھن پھیلا لیا۔

"میں نہ کہتا تھا کہ تم ذلیل جانور ہو۔ اور بھلائی کا بدلہ بُرائی سے دو گے"۔ کسان نے کہا۔

"او ہو! باتیں بنانا تو بڑا آسان ہے۔ لیکن دُنیا کا طریقہ یہی ہے۔ کہ نیکی کا بدلہ بُرائی ہوتا ہے"۔ سانپ نے جواب دیا۔

"مَیں نہیں مانتا، نیکی خود اپنا انعام ہے"۔ کسان نے کہا۔

"تم غلطی پر ہو"۔ سانپ نے جواب دیا۔ "مَیں تم سے بہتر جانتا ہوں۔ کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے"۔

"چلو کسی تیسرے شخص سے فیصلہ کرا لیتے ہیں"۔ کسان نے تجویز پیش کی۔

"بہت بہتر" سانپ نے اس کے گلے میں اچھی طرح لپٹے ہوئے

جواب دیا۔

کسان کو مجبوراً جنگل میں آگے جانا پڑا۔ راستے میں انھیں ایک بوڑھا اور تباہ حال گھوڑا ملا۔ وہ خودرَو گھاس پر منہ مار رہا تھا۔ وہ ایک ٹانگ سے لنگڑا اور ایک آنکھ سے کانا تھا۔ اس کی پُشت پر کاٹھی سے گہرے زخم پڑے ہوئے تھے۔ اور مشکل ہی سے اس کے مُنہ میں کوئی دانت ہوگا۔

اس حیوان سے انھوں نے سوال کیا کہ اس دنیا میں نیکی کا اجر اچھا ملتا ہے یا بُرا۔

"بے شک نیکی کا انجام بُرا ہوتا ہے"۔ گھوڑے نے جواب دیا۔ "میں نے اپنے مالک کی بیس سال خدمت کی۔ اسے اپنی پشت پر اٹھائے پھرتا۔ اور اس کی گاڑی کھینچتا رہا۔ اور اس دَوران مَیں ہمیشہ پھونک پھونک کر قدم اُٹھاتا تھا کہ مبادا میرا پاؤں نہ پھسل جائے اور کہیں اسے چوٹ نہ لگ جائے۔ جب تک میں جوان اور طاقت ور رہا۔ تو مجھ سے بڑا اچھا سلوک کیا جاتا اور اچھی خوراک ملتی۔ روزانہ غسل کرایا جاتا۔ میری صفائی کا خاص خیال رکھا جاتا۔ میرے لیے ایک آرام دہ اصطبل تھا۔ میرے تھان پر ہمیشہ صاف بھُوسے کا بستر لگا رہتا۔ چونکہ اب میں بوڑھا اور کمزور ہو گیا ہوں اس لیے پن چکی میں جوت دیا گیا ہوں۔ اور اب مجھے ہر موسم میں دن رات یہاں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مجھے کھانے کو کچھ نہیں دیا جاتا۔ سوائے اس کے جو کچھ یہاں پاتا ہوں —— نہیں —— نہیں نیکی کا انعام ہمیشہ بُرا ہوتا ہے"۔

"کیا میں نہ کہتا تھا۔ اور اب میں تمھیں ڈس لوں گا۔" سانپ نے کہا

"نہیں" کسان نے التجا کی۔ ایک لمحہ اور انتظار کر لو۔ وہ دیکھو رینارڈ لومڑ آ رہا ہے۔ اس کی رائے بھی پوچھنا چاہیے۔"

رینارڈ بڑے مزے سے اسی طرف آ رہا تھا۔ وہ کچھ فاصلے پر رُک گیا اور انھیں غور سے دیکھنے لگا۔ وہ ایک نظر ہی میں بھانپ گیا کہ آدمی سخت مصیبت میں گرفتار ہے۔

سانپ نے رینارڈ سے پوچھا۔ "یہ سچ نہیں کہ نیکی کا انجام بُرا ہوتا ہے یا جیساکہ اس آدمی کا خیال ہے کہ بعض اوقات نیکی کا بدلہ بھی نیکی ہوتا ہے۔"

"اچھا ہی بولنا" کسان نے سرگوشی میں کہا۔ "اور پھر میں تمھیں دو موٹی بطخیں دوں گا۔"

سانپ تو یہ سرگوشی سُن نہ سکا۔ لیکن لومڑ نے سُن لی اور پھر جواب دیا۔ "اچھے کاموں کا اچھا انعام ملتا ہے۔" اور ساتھ ہی وہ سانپ پر لپکا اور اس کی گردن پر اس زور سے کاٹا کہ وہ زمین پر آ رہا۔ لیکن مرنے سے پہلے اسے کہنے کی مہلت مل گئی۔ "نہیں اچھے کام کا انجام بُرا ہوتا ہے۔ اس کا ثبوت ابھی ملا ہے۔ میں نے آدمی کی جان بچائی اور خود اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا ہوں۔"

سانپ مر چکا تھا اور کسان آزاد تھا۔ اس نے لومڑ سے کہا۔ "میرے ساتھ گھر چلو اور بطخیں لے آؤ۔"

"نہیں آپ کا شکریہ"۔ رینارڈ نے جواب دیا۔ "میں تمھارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ تم مجھ پر کتے چھوڑ دو گے۔"

"بہتر تو پھر یہاں انتظار کرو۔ اور میں ابھی تمھیں بطخیں لا دیتا ہوں۔"

کسان نے جواب دیا۔

کسان دوڑتا ہوا گھر پہنچا اور بیوی سے کہا "نیک بخت! جلدی سے دو موٹی بطخیں بوری میں بند کر دو۔ میں رینارڈ لومڑ کے لیے ناشتے کا وعدہ کر آیا ہوں"۔

اس کی بیوی نے ایک بوری میں کچھ بند کر کے اس کے سپرد کر دی۔ کسان بوری کندھے پر لادے لومڑ کے پاس پہنچا۔ "لو اپنا انعام جس کا تم سے وعدہ کر کے گیا تھا۔"

"شکریہ" لومڑ نے کہا "آخر میں نے سچ ہی کہا تھا۔ کہ نیکی کا بدلہ نیکی ہی ہوتا ہے۔"

لومڑ نے بوری اپنی پشت پر رکھی اور اپنے بھٹ کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ "یہ بطخیں واقعی بہت بھاری ہیں۔" لومڑ نے اپنے بھٹ میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ اور بوری کی رسی کو اپنے تیز دانتوں سے کاٹنے لگا۔ رسی کٹ چکی۔ تو یک لخت بوری سے دو خونخوار کتے لپکے اور اسے گلے سے دبوچ لیا۔ اور ایک منٹ کی جدوجہد کے بعد ٹھنڈا ہو گیا۔

سچ ہے کہ نیکی کا انجام بہت ہی بُرا ہوتا ہے۔

اسپین

ناگن

اسپین تضاد اور تند جذبات کا گہوارہ ہے۔ اس کی روح مشرقی لیکن جغرافیائی لحاظ سے یورپین ہے۔ اس ملک میں کئی انقلاب آئے۔ لیکن لوگوں کے تصورات وعقائد، خصائل وعادات میں کوئی نمایاں فرق نہیں آیا۔ ان کی محبت اور تنفر انتہائی عروجی مقام سے شروع ہوتی ہے اور اسی مقام پر ختم ہوتی ہے۔

ناگن یا ناگ استری، اس ملک کی مشہور عالم لوک کہانی ہے۔ جس سے عوام کے ان توہمات کا پتہ چلتا ہے۔ جو ہمارے ہاں عام طور پر پائے جاتے ہیں۔ حسن، بدی اور کینہ پروری کا مظہر عورت بتائی گئی ہے۔ ہسپانوی نژاد عورت کی بے پایاں قوت پر یقین رکھتے ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ مردوں کی ذہنی نشو ونما اور جذبات کی فراوانی میں عورت حرفِ اوّل اور حرفِ آخر بھی ہے۔

یہ کہانی عوامی فن کا ایک دل آویز مرقع ہے۔

ناگن

بارھویں صدی کا ذکر ہے۔ کہ ایک شخص ڈان یوآن ڈی امریلو مقام رودا کے نزدیک رہتا تھا۔ وہ خود تو نوجوان نہ تھا۔ البتہ اس کی بیوی نوجوان اور حسین عورت تھی۔ اس سے وہ والہانہ محبت کرتا تھا۔ ڈان یوآن نے اپنی بیوی کا تعارف اپنے دوستوں سے بڑے اہتمام سے کرایا۔ وہ اپنے حسن جہاں سوز سے لوگوں میں ایک عجیب قسم کی سنسنی پیدا کرنے کا موجب بنی۔ تاہم وہ دوست یا ہمدرد بنانے کی بجائے بڑی آسانی سے اپنے دشمن بناتی تھی۔

یہ کوئی شخص بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں سے آئی تھی۔ اور شادی سے پہلے اس کا اصلی نام کیا تھا۔ لیکن سب کو معلوم تھا کہ ڈان یوآن کئی

سال گھر سے باہر رہا تھا۔ اور اس عرصے میں کسی دوست یا دشمن کو اس کے متعلق کوئی خبر موصول نہیں ہوئی تھی۔ جیسے وہ غیر متوقع طور پہ گھر سے گیا تھا اسی طرح اچانک واپس آ گیا۔ البتہ اس کے ہمراہ اس کی نوجوان بیوی تھی۔

اس کی بیوی کے کردار اور اصلیت کے بارے میں کئی قصے مشہور تھے۔ کوئی کہتا کہ وہ سوانگ رچانے والوں سے تعلق رکھتی ہے۔ اور ڈان یوآن نے ذلت کی زندگی سے نکال کر اپنی امارت اور خاندان کے نام سے مرعوب کر کے اس سے شادی کر لی۔ اور کوئی کہتا کہ وہ خانہ بدوش ساحرہ ہے اور اس نے ڈان یوآن پر ایسا جادو کر دیا تھا کہ وہ اس کا ہمیشہ کے لیے مطیع ہو گیا ہے۔

ان قصوں میں حقیقت کا شائبہ تک نہ تھا۔ لیکن لوگ ان قصوں کو بار بار دہراتے اور ان پر یقین رکھتے تھے۔ اس دوران میں ڈونا پے پا اپنی جان پہچان کے لوگوں میں گھومتی اور زندگی سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ جو قصے اس کے بارے میں مشہور تھے۔ وہ ان سے بے خبر تھی۔ البتہ اس کی موجودگی میں لوگوں پر جو عجیب قسم کا خوف پیدا ہوتا تھا۔ وہ اس سے پوری طرح باخبر تھی اسے معلوم تھا کہ لوگ اکثر اس سے کنی کتراتے ہیں اور اس سے نفرت کرتے ہیں۔

وہ حسین ترین عورت تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش دل نشیں، آنکھیں سیاہ اور اس کا سر کسی خوبصورت مجسّمے کی مانند تھا۔ اس کا جسم سرو کی مانند سیدھا اور لچکیلا تھا۔ لیکن اس کے بے عیب حسن کے باوجود لوگ اسے دیکھ کر ایک عجیب قسم کی پریشانی محسوس کرتے تھے۔ وہ اس پریشانی اور خوف کی نوعیت بتانے سے قاصر تھے۔ البتہ وہ یہ ضرور محسوس کرتے

کہ کوئی ایسی بات ہے جس سے انھیں ڈر لگتا ہے۔ اس کی چند حرکتیں عجیب تھیں۔ کسی بات پر جب وہ خوش ہوتی تو اپنا سر بلند کرتی تو یہ تین یا چار انچ لمبا معلوم ہوتا تھا۔ اور باقی جسم کو لہراتی تھی۔ اس کے برعکس جب وہ ناراض ہوتی یا کسی پر اسے غصہ آجاتا تو اس کا سر چوڑا معلوم ہوتا اور اس کے ہاتھ کا لمس کانٹا معلوم ہوتا تھا۔ وہ اپنے پڑوسیوں کے بارے میں بڑی باتیں کہنے اور سننے میں بڑی خوشی محسوس کرتی۔ مختصر یہ کہ وہ اتنی نفرت انگیز تھی جیسے کہ ایک عورت ہو سکتی ہے۔

ڈان یوآن اور اس کی بیوی بظاہر بڑی پُرسکون زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن خانہ زاد خدّام اس سے مختلف قصہ بیان کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ آپس میں سخت جھگڑا کرتے ہیں اور بعض اوقات ڈان یوآن اپنی بیوی سے بڑا خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب اس کا سر چوڑا معلوم ہوتا ہے۔ اور واقعی وہ بڑی ہیبت ناک نظر آتی تھی۔ لوگوں کا بیان تھا کہ جب اس کے چہرے پر غصے کے آثار ظاہر ہوتے تو معمر ڈان خوف سے کانپ اٹھتا تھا۔ خواہ وہ اس وقت دوسرے لوگوں کی معیّت میں ہی کیوں نہ ہوتا۔

کئی سال سے یہی واقعات ہو رہے تھے۔ لیکن ڈان یوآن اور اس کی بیوی بظاہر بڑی مطمئن اور پُرسکون زندگی بسر کرتے رہے۔ حقیقت یہ تھی کہ خاندان کے قدیم ملازم ایک ایک کرکے ملازمت چھوڑ گئے تھے۔ جب ان ملازموں سے دریافت کیا گیا کہ ملازمت ترک کرنے کا اصل سبب کیا تھا تو

انھوں نے جواب دیا کہ گھر کی مالکہ جادوگرنی ہے اور فرشتہ جبریل بھی اس کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ ان کا آقا یہ سب کچھ کیسے برداشت کر رہا تھا۔ وہ یہ سمجھنے سے معذور تھے۔ سوائے اس کے کہ ڈان یوآن جادو کے زیر اثر تھا۔

یہ خبر پھیل گئی کہ ڈان یوآن کا چہیتا بھانجہ آراگون سے اپنے ماموں کے پاس آرہا ہے۔ اور ڈان اسے اپنی دولت کا وارث بنانے کا رسمی طور پر اعلان کرے گا۔ ڈان یا اس کی بیوی کے اولاد نہ تھی۔ اس لیے وہ اپنی جائداد بھانجے کو سونپنا چاہتا تھا۔ جو اس کی مرحومہ بہن کا اکلوتا بیٹا تھا۔ چند دنوں کے بعد ڈان یوآن کے دوستوں اور پڑوسیوں کو اس اجنبی سے متعارف کرانے کے لیے دعوت دی گئی۔

ڈان لوئی تقریباً ستائیس سال کا بے تکلف، خوش شکل اور نیک دل جوان تھا۔ جو بھی اس سے ملتا، وہ لوئی کی طرف کھنچتا۔ اپنے ماموں کے وارث کی حیثیت میں اس کی جو تعریف و توصیف کی گئی اس نے اس پر فخر یا خاص خوشی کا اظہار نہ کیا۔ بلکہ گفتگو کے دوران میں اس نے اپنی مفلسی کا ذکر چھیڑ دیا۔ اور اپنے لڑکپن کی تکالیف اور خوشی کے چھوٹے چھوٹے واقعات سناتا رہا۔ اس پر اس کی ممانی بہت ناراض ہوئی۔

ڈرتا پلے یا مفلس و نادار رشتہ داروں کے متعلق سننا بھی برداشت نہ کر سکتی تھی۔ اور وہ کیسے گوارا کرتی کہ ڈان یوآن ڈی امر یلو کا کوئی مفلس رشتہ دار بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے نوجوان ڈان لوئی پر ایسی نفرت انگیز غضب ناک اور خطرناک نگاہ ڈالی کہ وہ کانپ گیا اور باقی وقت بالکل خاموش

رہا۔ مہمانوں نے اسے اپنی گفتگو میں شامل کرنے کی بے سود کوشش کی۔ اسے ڈرنا پے پا کی ایک کھری نظر نے ہی اتنی زبردست جھاڑ پلائی تھی کہ وہ پھر زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ششدر و حیران سوچ رہا تھا کہ یہ کس قسم کی عورت ہو سکتی ہے۔ اس نے وہ دیکھا جو دیگر مہمان محسوس نہ کر سکے۔ کیونکہ اس لمحے ڈرنا پے پا کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ ڈونا کا سر چوڑا ہو گیا تھا اور اس کی آنکھیں لمبی اور سکڑ گئی تھیں اور اس نے پھنکارتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری تھی جو غصّے کی وجہ سے سفید پڑ گئے تھے۔ اور اس کی زبان درمیان سے پھٹی ہوئی تھی۔

اس نے اپنی ممانی کے متعلق بڑے عجیب و غریب قصّے سُن رکھے تھے۔ لیکن ابھی تک اس نے ان قصوں پر کوئی توجہ نہ دی تھی۔ لیکن اس کے چہرے کو یوں بدلتے دیکھ کر ہر بات جو اس نے سنی ہوئی تھی، اس کے حافظے پر اُبھرنے لگی۔ اور وہ ایک کوشش سے مہمانوں میں بیٹھ سکا اور اپنے آپ پر جبر کر کے دعوت میں دلچسپی ظاہر کرتا رہا۔

جیسے ڈان لوئی کی جان پہچان والے بڑھتے گئے۔ تو ویسے ہی اس کی ہر دلعزیزی میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہر شخص اسے پسند کرتا ہے۔ اس کا ماموں تو اس کی پرستش کرتا تھا اور اسے اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا تھا۔ کیونکہ اسے دیکھ کر اسے اپنی مرحومہ بہن اور اپنی گزری ہوئی جوانی یاد آجاتی تھی۔ جب وہ دنیا کی ذلت اور حماقتوں میں گرفتار نہ ہوا تھا۔

ڈونلپے پا اپنے معصوم بھانجے کی ہر دلعزیزی اور بے تکلّف سبھاؤ

کی زیادہ دیر مدافعت نہ کر سکی۔ حالانکہ وہ اس سے ہمیشہ کتّی کترانے کی کوشش میں رہتا۔ اور اس لیے وہ اس سے ناراض بھی رہتی تھی۔ لیکن وہ اس سے انتقام نہ لے سکی۔ جیسا کہ وہ اکثر دوسروں سے لے لیا کرتی تھی۔ کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ڈان لوئی سے محبت کرنے لگی تھی۔

ڈان لوئی، ڈونا پےپا سے ڈرتا تھا اور اس کی مسلسل کوشش رہتی کہ ہر معقول طریقے سے ممانی سے بات ہی نہ کر پائے۔ مگر وہ اسے یوں آسانی سے چھوڑنے والی نہ تھی۔ ڈونا پےپا کی کوشش ہوتی کہ وہ اس کی آنکھوں کے سامنے ہی رہے۔ اگر وہ چہل قدمی کے لیے باہر جاتا تو ڈونا کا پہنچنا بھی یقینی تھا اور ڈونا کو یقین ہو گیا تھا کہ محبت یا بہتری کی خاطر نہیں بلکہ رقابت سے اس کی نگرانی کی جا رہی ہے۔

ایک شام وہ اپنے کسی دوست کے ہاں مدعو تھا۔ وہاں سے کافی رات گئے واپس لوٹا۔ جب وہ ماموں کے گھر پہنچا تو اس نے اپنی چھوٹی سی قندیل جلائی اور اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تو ایک رستے کے اتیارت اسے ٹھوکر لگی۔ جب روشنی میں اس نے دیکھا کہ وہ رستہ نہیں بلکہ ایک طویل سانپ ہے تو اس کے ہوش اُڑ گئے۔ سانپ بڑی سرعت سے سیڑھیوں پر بھاگا اور اس کے ماموں کی خواب گاہ میں گھس گیا۔

اس کے دماغ میں یہ خیال کوندے کی مانند پھر گیا۔ کہ اس کے ماموں کی زندگی خطرے میں ہے۔ اس نے جلدی سے خواب گاہ کے دروازے پر دستک دی۔ اور بلند آواز سے ماموں کو پکارنے لگا۔ کم از کم پانچ منٹ

کے بعد اسے جواب ملا۔ یہ پانچ منٹ اسے پانچ گھنٹے معلوم ہوتے تھے۔
اس کا ضعیف ماموں گہری نیند سوتا تھا۔ آخر وہ بیدار ہوا۔ اور دروازہ کھول
کر اس سے ترش لہجے میں پوچھنے لگا۔

"اتنی رات گئے اسے پریشان کیوں کیا جا رہا ہے۔"

"عزیز ماموں! میں نے ابھی ابھی دیکھا ہے۔ کہ ایک کالا سانپ آپ
کے دروازے میں گھسا ہے اور مجھے ڈر تھا کہ بے خبری میں آپ کو کوئی
گزند نہ پہنچ جائے۔"

"یہ بکواس ہے۔" ڈان لوئی نے جواب دیا۔ لیکن ساتھ ہی اس کا رنگ
زرد ہو گیا۔ "یہاں کوئی سانپ نہیں"۔ یہ کہہ کر دروازہ بند کرنے لگا۔ لیکن
ڈان لوئی کمرہ دیکھنے پر مصر رہا۔

کمرے کو اچھی طرح دیکھا گیا۔ لیکن وہاں سانپ کا نام و نشان نہ ملا۔
اس پر اس کا ماموں بہت ناراض ہوا۔ ڈرناپتے پا سو رہی تھی۔ اس نے
آہستہ سے آنکھیں کھولیں اور ڈان لوئی پر خوف ناک نگاہیں گاڑ دیں۔ اس
کا سر چوڑا اور آنکھیں گول ہو رہی تھیں۔ اور ڈان لوئی پریشانی اور
خوف سے یہ سوچتا ہوا کہ اس کا دماغ تو ماؤف نہیں ہو گیا۔ وہ اپنے کمرے
میں واپس آیا۔ کافی دیر تک اسے نیند نہ آئی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو
اسے خواب میں بڑے ہیبت ناک سانپ نظر آتے رہے۔

دوسری صبح جب وہ اپنے کمرے سے نیچے اترا تو کھانے کے کمرے
میں صرف اس کی ممانی ڈوناپتے پا موجود تھی۔ اس کا ماموں کسی کام

سے گھر سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس وقت ڈان لوئی کو اپنی ممانی سے اتنی شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی اور بڑی کوشش اور اپنی طبیعت پر جبر کرکے اس سے گفتگو کرنے پر خود کو تیار کر پایا۔ لیکن اس کی ممانی اسے اپنے سوالات سے تنگ کرنے میں بڑی خوشی محسوس کر رہی تھی اور ڈان لوئی کو ایک معزز ہسپانوی کی حیثیت سے جواب دینے ہی پڑتے تھے۔ لیکن وہ زیادہ دیر برداشت نہ کر سکا اور وہاں سے جانے لگا۔ ڈونا پتے پا نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ کر کہنے لگی۔

"تم مجھ سے اتنی نفرت کا اظہار نہ کرو! اگر مجھ سے محبت کرنا نہیں سیکھ سکتے تو مجھ سے خوف کھانا سیکھ لوگے۔"

اس نے اپنی کلائی پر ایک عجیب قسم کی سنسنی سی محسوس کی جیسا کہ ڈسا گیا ہو۔ اس نے زور سے ڈونا پتے پا کا ہاتھ جھٹک دیا اور جلدی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ اپنی کلائی پر سنسناہٹ کے بارے میں سوچتا رہا۔ اور شام تک اس کا بازو سوج گیا اور دم بدم درد سے ٹیسیں بڑھنے لگیں۔ ہاتھ کی انگلیاں اتنی سوج گئی تھیں کہ وہ اپنا ہاتھ بند نہ کر سکتا تھا اور نہ کھول سکتا تھا اور نہ ہی وہ اس سے کوئی چیز اٹھا سکتا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ بہت پریشان ہوا۔ اور قریب ہی ایک سنیاسی کے پاس پہنچا، جو نہ صرف اپنی بزرگی بلکہ ہر قسم کے زہر کے علاج کے لیے مشہور تھا۔

بازو کا معائنہ کرنے کے بعد اس نے بتایا کہ یہ تو سانپ کا ڈسا ہوا ہے۔

"نہیں۔ ایسا نہیں"۔ ڈان لوئی نے جواب دیا۔ "غصے میں میری

ممانی نے میری کلائی زور سے دبائی تھی اور یہ اسی کا نتیجہ ہے۔"

"تو پھر یہ سانپ کے کاٹنے سے بھی زیادہ بُرا ہوا۔ کیونکہ ناگ استری[۵۱] کا ڈسا ہوا، بعض اوقات زیادہ خوفناک نتائج کا حامل ہوتا ہے۔" ستیاسی نے کہا۔

"کیا آپ میری کوئی مدد کر سکتے ہیں؟" ڈان لوئی نے پریشانی میں پوچھا "میں اس سے سخت نفرت کرتا ہوں۔ اس نے کئی ہفتوں سے میرے ناک میں دم کر رکھا ہے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ لیکن تم اس کے ہاتھوں اور مصائب اٹھاؤ گے۔ زینے کی بجائے وہ تمھارے کمرے میں جا گھسے گی۔ لو یہ بوٹی اور اسے اپنی کلائی پر باندھ لو۔ لیکن اسے پانی سے بار بار تر کرتے رہنا۔ تمھارا بازو درست ہو جائے گا۔ جہاں تک اسے قابو کرنے کا تعلق ہے۔ یہ ذرا مشکل کام ہے۔ اگر تم رات بھر جاگتے رہو، تو تم اس پر حاوی ہو سکتے ہو۔ اور جب بھی تمھاری آنکھ لگ گئی تو پھر تم اس کے رحم و کرم پر ہو گے۔"

"مجھے کوئی ایسا طریقہ بتائیے کہ اسے قتل کرنے کے بغیر اسے ٹھکانے لگا سکوں۔" ڈان لوئی نے پوچھا۔

---

۵۱ اسپین میں آج بھی اس قسم کے توہمات پائے جاتے ہیں کہ بدکار عورت خاص مدت کے بعد ہر رات کو سانپ بن جاتی ہے۔ اور جس سے ناراض ہوتی ہے تو اسے ڈس لیتی ہے۔ اور اس کا علاج سانپ کے ڈسنے سے بھی مشکل ہوتا ہے۔

"جب تم اپنے دروازے کے قریب سانپ دیکھو، تو تلوار سے اس پر حملہ کر دو۔ پھر اس کا ردِ عمل مجھے آکر بتاؤ۔"

سنیاسی کے اس مشورے سے ڈان لوئی کچھ مطمئن ہوا۔ اور جب سنیاسی کے علاج سے اس کے بازو کو آرام آگیا تو اس نے سنیاسی کے دوسرے مشورہ پر عمل کرنے کا تہیّہ کر لیا۔

اسی رات جب وہ اپنے پلنگ پر لیٹا ہی تھا تو پائنتی کے قریب بہت بڑا سانپ، کنڈلی مارے نظر آیا۔ اس نے بڑی احتیاط سے اپنی تلوار سنبھالی اور اس کی دُم پر وار کیا۔ سانپ پیچھے ہٹ کر اس پر جھپٹنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے دوسرا وار کیا۔ اب کے اس کی دُم کا تھوڑا سا حصّہ کاٹ لیا۔ سانپ پھنکارتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا اور سیڑھیوں کے نیچے غائب ہو گیا۔ اور پھر ڈان یوآن کے کمرے میں گھس گیا۔

دوسری صبح ڈوناپیّا اپنے کمرے سے باہر نہ آئی۔ ڈان لوئی کے دریافت کرنے پر اس کے ماموں نے بتایا کہ ڈوناپیّا کو نیند میں چلنے کی عادت ہے اور رات کو کسی تیز دھار چیز سے اس نے اپنے پاؤں زخمی کر لیے ہیں۔

یہ سن کر ڈان لوئی نے دل میں کہا کہ میں جانتا ہوں اصل معاملہ کیا ہے اور ساتھ ہی اپنے ماموں سے ہمدردی کا اظہار کرنے لگا، جو واقعی بہت پریشان ہو رہا تھا۔

ڈان لوئی نے دُم کے دو ٹکڑوں کو اپنی میز کے دراز میں چھپا دیا۔ صبح کو

جب اس نے ان ٹکڑوں کو دیکھا تو وہ انسان کے پیروں کی ایڑی اور تلوے کے ٹکڑے تھے۔

چند روز تک اس نے ممانی کو کسی صورت میں دیکھا اور نہ اس کے متعلق کچھ سنا۔ آخر کار وہ اپنے کمرے سے باہر آئی اور اس سے بڑے تپاک سے ملی۔ ڈان لوئی نے محسوس کیا کہ وہ چلتے چلتے رُک جاتی ہے۔ وہ سنیاسی کے پاس گیا اور سب واقعات سنائے۔

"بیٹے اس پر ترس نہ کھاؤ" سنیاسی نے کہا۔ "وہ تمھاری تباہی کا تہیہ کر چکی ہے۔ اگر تم نے اس پر رحم کیا تو وہ تم سے زیادہ سختی سے پیش آئے گی۔ اس بار اس کے سر کے نیچے ایک فٹ پر وار کرو۔ اور وہ اپنا زخم چھپا نہ سکے گی۔"

سنیاسی کی اس گفتگو کے چند روز بعد اس نے سانپ کو صحن میں اپنا منتظر پایا اور حسب معمول وہ اس سے پہلے سیڑھیاں چڑھ کر اس کے کمرے میں ایک کونے کی الماری پر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس مکان کے دروازے اور کھڑکیاں سانپ کے گزرنے کے لیے خاص طور پر بنائی گئی ہیں۔ کیونکہ ہر دروازے کے نیچے دو انچ دراز تھی۔

ڈان لوئی نے تلوار نکالی اور سانپ کے سر سے ایک فٹ نیچے بھرپور وار کیا۔ سانپ دروازے کی طرف لپکا۔ پہلے اس کا سر باہر رینگ گیا۔ پھر اس کا باقی حصہ باہر نکلا۔ اور کمرے کے باہر یہ دونوں ٹکڑے مل گئے اور سانپ اس کے ماموں کے کمرے میں غائب ہو گیا۔ اُس رات کے بعد دو

ماہ تک ڈونا پتے یا کسی کو نظر نہ آئی ۔

"اس کی ایک انگلی پر گہرا زخم ہو گیا ہے اور درد کی وجہ سے وہ کئی راتیں سو نہیں سکی ۔ اس زخم کے مندمل ہونے تک وہ اپنے کمرے ہی میں آرام کرے گی ۔" اس کے ماموں نے اسے مطلع کیا ۔

یہ سن کر ڈان لوئی اپنے دوست سنیاسی کی طرف روانہ ہوا ۔ راستے میں اس کی ملاقات اپنے ناتل کے زمانے کے ایک بوڑھے خدمت گار سے ہوئی ۔ جو ڈان یوآن کی شادی کے بعد بھی ان کی خدمت میں رہ چکا تھا ۔ لیکن یہ پہلا ملازم تھا جس نے خود ملازمت چھوڑ دی تھی ۔

"کافی عرصے سے مجھے اپنے آقا اور آپ کے متعلق تشویش تھی کہ وہ بے خبر ہیں اور سنائیے کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے ۔ چونکہ میں نے خود اپنی مرضی سے ملازمت ترک کی تھی ۔ اس لیے اب میں خیریت بھی پوچھنے گھر نہیں جانا چاہتا ۔ مجھے اپنے آقا کو اس لیے چھوڑنا پڑا کہ میں اس گھر میں ایک ناگن کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا یعنی ڈونا پتے یا آپ کی ممانی ۔"

"اس سے تمہارا کیا مطلب ہے ؟ کیا واقعی تم نے بھی گھر میں سانپ دیکھا تھا ؟" ڈان لوئی نے حیرانگی سے پوچھا ۔

"ہزاروں مرتبہ" ۔ بوڑھے ملازم نے بیزاری سے جواب دیا ۔ وہ گھر میں ہر وقت میرے تعاقب میں رہتی تھی ۔ حتیٰ کہ میں اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ۔ میری کوٹھری میں ، باورچی خانے میں ، صحن میں ۔ غرض کہ وہ ہر جگہ موجود ہوتی ۔ آخر میں نے وہاں سے کوچ کرنا ہی مناسب سمجھا ۔ ایک بار

میں نے اپنے آقا سے اس بارے میں بات کی تو وہ بہت غضب ناک ہوئے اور مجھے جھوٹا سمجھنے لگے۔ جناب آپ نے بھی کبھی سانپ دیکھا۔ اس گھر کا ہر فرد تو اسے دیکھ چکا ہے۔"

" اگر تم مجھ سے یہ کہلوانا چاہتے ہو۔ تو پھر میں کہوں گا کہ میں نے بھی ایک چیز سانپ کے روپ میں دیکھی ہے۔ میں نے اس کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کاٹ دیا ہے۔ قتل کرنے کے سوا اب اور میں کیا کر سکتا ہوں۔" ڈان لوئی نے جواب دیا۔

" ایک چیز اور ـــــ" بوڑھے جورج نے ہمت کرتے ہوئے کہا۔" ایک چیز اور ـــــ اور وہ یہ ہے کہ جب وہ دونوں گھر سے باہر جائیں تو آپ آقا کے کمرے میں جائیے۔ کمرے میں بائیں ہاتھ کی کھڑکی کے نیچے ایک الماری کو کھولیے آپ کو وہاں ایک عجیب قسم کی کھال ملے گی۔ اس پر سانپ کی مانند دھبے ہوں گے۔ یہ کھال لپیٹی ہوئی دراز کے ایک کونے میں ہوگی۔ اگر آپ اسے جلا دیں تو پھر یہ سانپ آپ کو کبھی تنگ نہیں کرے گا۔

جو کچھ تم کہہ رہے ہو کیا تمھیں اس پر یقین بھی ہے۔" ڈان لوئی نے پوچھا۔

"مجھے قطعی طور پر یقین ہے۔" جورج نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ پھر دونوں نے اپنی اپنی راہ لی۔

ڈان لوئی جتنا بوڑھے ملازم کے مشورے پر غور کرتا، اتنا ہی وہ اپنے آپ کو اس پر عمل کرنے پر آمادہ نہ پاتا۔ اسے اپنے ماموں کے کمرے سے

سانپ کی کینچلی جیسا ناغداری اور فریب معلوم ہوتا تھا اور جب کہ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کے نتائج کیا نکل سکتے تھے۔ آخر کار اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے دوست سنیاسی سے اس بارے میں مشورہ کرے گا۔

سنیاسی نے جب یہ قصہ سُنا تو کافی دیر تک وہ خاموش بیٹھا رہا۔ اور پھر سوچتے ہوئے بولا

"مَیں تمھاری پریشانی کو سمجھتا ہوں۔ اور ماموں کے متعلق جو تمھارے احساسات ہیں مجھے ان سے بھی ہمدردی ہے۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ ڈونا پے پا کے خطرناک اثرات کو ختم کرنے کا اور کوئی طریقہ نہیں۔ اور پھر تم اکیلے ہی اس مصیبت میں گرفتار نہیں بلکہ کئی اور بھی ہیں، جن کا جینا اس نے حرام کر رکھا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ایسے لوگ دنیا سے اٹھا لیے جائیں۔ کیونکہ اپنے خداداد حُسن سے وہ جو مسرت بخشتے ہیں اس سے کہیں زیادہ مصائب و آلام کا موجب بنتے ہیں۔ بہرکیف کم از کم ایک مہینے تک تو وہ تمھیں کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتی۔ وہ کافی زخمی ہو چکی ہے۔ اور جب تک اس کے زخم مندمل نہیں ہوں گے۔ وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلے گی۔ لیکن اگر اس نے پھر تمھیں دِق کرنا شروع کر دیا تو میرے خیال میں تمھیں یہ معاملہ اپنے ماموں کے گوش گزار کرنا چاہیے۔ اور اسے اپنے ارادے سے بھی مطلع کر دینا چاہیے۔"

ڈان لوئی نے سنیاسی کے اس مشورے پر عمل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ ایک مہینے تک ڈونا پے پا اپنے کمرے میں رہی اور ڈان لوئی نے

اس عرصے میں کہیں بھی وہ سانپ نہ دیکھا۔ جب ڈونا پتے پا اپنے کمرے سے نکلی تو اس نے نہایت نفاست سے ریشمی رومال سے اپنا ہاتھ چھپایا ہوا تھا۔ ڈان لوئی نے ظاہرداری سے اس کی خیریت پوچھی۔ ڈونا پتے پا کا اس سوال سے رنگ اُڑ گیا۔ تاہم اس نے بڑی شان سے جواب دیا کہ وہ بخیریت ہے۔

وہ بہت لاغر ہو چکی تھی۔ اس کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا۔ اور اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ ڈان لوئی کو ڈونا کی یہ حالت دیکھ کر بڑا ترس آیا۔ اس نے اسے بری طرح زخمی کیا تھا۔ اس کا ماموں ہر ایک کو بڑی تفصیل سے اپنی بیوی کی بیماری کا واقعہ سناتا۔ کہ بے چاری ڈونا کے ہاتھ کو کاٹنا پڑا۔ کیونکہ زخم میں زہر پھیل چکا تھا اور اس سے ڈونا کی زندگی خطرے میں تھی۔ لیکن چند ہی لوگوں نے اس کہانی پر اعتبار کیا۔ کیونکہ ڈان لوئی کی سانپ سے مڈبھیڑ کے قصّے کسی نہ کسی طرح عام ہو چکے تھے اور ہر شخص کو یقین تھا کہ ڈونا پتے پا کی یہ بیماری اس کے مظالم کی پہلی سزا ہے۔

کچھ عرصے بعد یہ مصیبت پھر شروع ہو گئی۔ ڈان لوئی گھر میں ہر جگہ اور ہر موقع پر سانپ کو کنڈلی مارے دیکھتا۔ صحن میں، سیڑھیوں میں یا اپنے کمرے کے کسی نہ کسی کونے میں، اپنے جوتوں میں، کمبل کے نیچے لباس کے اُوپر حتّیٰ کہ اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ ہمیشہ کے لیے اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے گا۔ اب اسے صبح و شام ہر طرف سانپ ہی نظر آتے تھے۔ ایک صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے سانپ کو اپنے بستر پر

پایا۔ وہ اس کے گرد چمٹ رہا تھا۔ ڈان لوئی نے بڑے زور سے اس پر مکے مارنے شروع کیے اور اسے زخمی کر دیا۔ سانپ خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ ڈان لوئی نے فیصلہ کر لیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ اپنے ماموں کو ان واقعات سے مطلع کروں۔ جب اس نے کھانے کے کمرے میں اپنے ماموں کو تنہا دیکھا تو اس نے پوچھا کہ ڈونا پے پا کا کیا حال ہے۔

معمر آدمی بڑا پریشان نظر آتا تھا۔ اور گھبرائے ہوئے لہجے میں کہنے لگا "صبح سے میں نے اسے نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ بخیریت ہو گی۔"

"آج صبح سے نہیں دیکھا" ڈان لوئی نے حیرانگی ظاہر کرتے ہوئے کہا "کیا وہ گھر میں نہیں؟"

"ہاں وہ گھر ہی میں ہے" اس کے ماموں نے جواب دیا۔ "مگر بعض اوقات جب اس کی طبیعت ٹھیک نہ ہو تو وہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتی۔"

"آہ" ڈان لوئی نے بڑے تصنع سے صرف اتنا ہی کہا اور گفتگو ختم ہو گئی۔

چند گھنٹوں کے بعد ڈان لوئی نے اپنے ماموں کو ایک کمرے میں اکیلا بیٹھے دیکھا۔ تو اس نے تمام واقعات سے آگاہ کرنا شروع کر دیا۔ پہلے تو ماموں بڑا غضب ناک ہوا۔ اور بات سننے ہی سے انکار کر دیا۔ لیکن جب ڈان لوئی نے اسے بتایا کہ اس کے گھر میں اسے کن مصائب اور الجھنوں سے دوچار ہونا پڑا ہے تو وہ خاموشی سے سننے لگا۔ ساتھ ہی اس کا رنگ زرد ہونے لگا۔

جب ڈان لوئی نے تمام واقعات سنا دیے تو کافی دیر تک خاموشی طاری رہی۔ آخر اس کا ماموں بولا۔

"میں اس معاملے میں کچھ نہیں کہہ سکتا اور نہ کسی قسم کی تمھاری مدد کر سکتا ہوں۔ میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ کیونکہ وہ سانپ میری زندگی کا ایک مسلسل روگ بن چکا ہے۔"

"تو پھر" ڈان لوئی نے جلدی سے کہا۔ "آپ مجھے موردِ الزام تو نہیں ٹھہرائیں گے۔ اگر میں اس سانپ کو سزا دینے کی کوشش کروں جس کا وہ مستحق ہے۔"

"نہیں۔ میں تمھیں الزام نہیں دوں گا۔ اگر واقعی تم یہ کر سکتے ہو" معمر ڈان یوآن نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ اسے یقین ہو گیا تھا۔ کہ اس کا بھانجہ سانپ کو ختم کرنے کا راز جانتا ہے۔

اس کے بعد کئی روز تک ڈان لوئی اپنے ماموں کی خاطر سانپ کی پریشان کن توجہ کو صبر سے برداشت کرتا رہا۔ اور تقریباً ایک مہینے کے بعد اسے موقع ملا کہ وہ اپنے ماموں کے کمرے میں چپکے سے جا سکے۔ اس روز اتفاق سے اس کا ماموں اور ممانی باہر گئے ہوئے تھے۔

جیسا کہ بوڑھے جورج نے اسے بتایا تھا۔ دریچے کے نیچے ایک الماری پڑی تھی۔ جب اس نے اس کی دراز کھولی تو ایک کونے میں عجیب سی کینچلی پڑی تھی۔ اس نے غور سے دیکھا تو یہ اسی سانپ کی کینچلی تھی۔ وہ اس کینچلی کو اپنے کمرے میں لے آیا۔ اس نے آگ روشن کی۔ لیکن ابھی

اس نے یہ کینچلی آگ میں پھینکی نہ تھی کہ اس کے ماموں اور ڈونا کے گھر میں داخل ہونے کی آواز آئی۔ اس نے جلدی سے کینچلی چھپا دی۔ اور یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ دونوں کہیں ادھر تو نہیں آ رہے۔ وہ نیچے بڑے کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔ یہ اطمینان کرکے وہ واپس اپنے کمرے میں آیا اور کینچلی کو نکال کر اسے اپنے ہاتھ پر لپیٹنے لگا۔ اور ساتھ ہی یک لخت نیچے سے ڈونا پےؔ پا کی خوفناک چیخوں کی آواز آنے لگی۔ وہ چیخوں کی وجہ معلوم کرنے کے لیے نیچے بھاگا۔ وہاں ملازموں نے اسے بتایا کہ یکایک ڈونا کو عجیب دورے پڑنے لگے ہیں۔ جیساکہ اس کا جسم طے کیا جا رہا ہو۔ تب اسے یقین ہو گیا کہ جو کچھ اسے بتایا گیا تھا وہ درست ہے۔ بغیر توقف کے اس نے کینچلی کو آگ میں پھینک دیا۔ اور دوسرے لمحے وہ جل کر راکھ ہو گئی۔

وہ اپنے ماموں کے پاس گیا۔ ڈان لوآن ہاتھ ملتا ہوا بڑی پریشانی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ ڈونا پےؔ پا ایک کوچ پر لیٹی تھی اور اس کا رنگ بہت ہی سفید ہو رہا تھا۔ خاندانی حکیم اس کے پاس بیٹھا اس کی نبض ٹٹول رہا تھا۔

"کیا ہوا — کیا ڈونا پےؔ پا بیمار ہیں"۔ ڈان لوئیؔ نے پوچھا۔

"ختم ہو گئی ہے"۔ حکیم نے جواب دیا۔" میں یہ دریافت نہیں کر سکا کہ کس عارضے سے موت ہوئی ہے۔ جب مجھے بلایا گیا۔ تو وہ بالکل تندرست تھی۔ اور اب بھی کوئی بیماری کے آثار نظر نہیں آتے۔ میں اس کی موت

کا سبب نہیں جانتا۔

ڈان لوئی نے سوچا کہ وہ اس موضوع پر روشنی ڈال سکتا ہے۔ لیکن اس نے اپنی زبان کو قابو میں رکھا۔

جب ڈونا پےّ پا کو غسل کرا کے تابوت میں رکھا گیا تو معمر راہبہ جو اسے آخری آرام گاہ کے لیے تیار کر رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اُس نے مُردے کے جسم پر سر سے پاؤں تک ایک سانپ کی چھاپ دیکھی۔

ڈونا پےّ پا کی موت کے بعد کئی سال تک ڈان یوآن اور ڈان لوئی بڑی خوشی سے زندگی بسر کرتے رہے۔ ڈان لوئی کا ماموں پھر جوان نظر آتا تھا۔ جب اس کے دوست اس سے ملنے آتے تو وہ کہتا۔

"کئی سالوں سے اس نے ایسی گہری خوشی محسوس نہ کی تھی۔ اور ڈان یوآن کے دوستوں کو یہ بات کچھ عجیب معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ سنیاسی اور دو ایک اشخاص ہی ناگ استری یا ناگن کا راز جانتے تھے۔

افریقہ

گیدڑ اور خشک سالی

اس تاریک براعظم کی زندگی میں جانور ایک بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔
انسان اور حیوان کی زندگی متوازی خطوط پر رواں دواں ہے۔
حبشیوں کی تمام لوک کہانیاں جانوروں سے متعلق ہیں۔ جانور
افریقہ کے دیہاتی کلچر کی نمائندگی کرتے ہیں۔
سفید فام انسانوں کی آمد مقامی باشندوں کی زندگی میں تغیر
رونما ہوا ہے۔ لیکن ان کے تمدن کی تاریخ ان کی یہ لوک کہانیاں
ہیں۔
گیدڑ اور خشک سالی افریقہ کی بہترین کہانی تصور کی جاتی
ہے۔

گیدڑ اور خشک سالی

یہ اس زمانے کا ذکر ہے۔ جب درندے دیہات میں مل جُل کر زندگی بسر کرتے تھے اور قدرت نے انھیں قوتِ گویائی بھی عطا کر رکھی تھی ایک سال بارش نام کو بھی نہ ہوئی ۔ علاقے کے سب ندی نالے اور تالاب خشک ہو گئے ۔ پانی کی قلت سے ہزاروں جانور مر گئے ۔ جانوروں کا یہ حال دیکھ کر شیر ببر نے سب جانوروں کا اجلاس بلایا۔ اور اجلاس میں کہا کہ کچھ ایسا بندوبست کرنا چاہیے کہ آئندہ خشک سالی سے ہم اپنی جانیں محفوظ رکھ سکیں۔

"ہمیں ایسے ملک میں چلنا چاہیے جہاں خشک سالی کا خطرہ نہ ہو۔" لنگور نے تجویز پیش کی ۔

یہ سُن کر کچھوا بولا "میں اتنا طویل سفر نہیں کر سکتا۔ راستے ہی میں مر جاؤں گا۔"

"ہمیں خشک سالی کا عرصہ سو کر گزارنا چاہیے۔" سانپ کی یہ تجویز تھی۔

"لیکن میں اتنا طویل عرصہ سو نہیں سکتا۔" خرگوش نے کہا۔

آخر بڑی بحث و تحیص کے بعد گیدڑ اور بھیڑیے نے یہ تجویز پیش کی کہ تمام جانور مل کر ایک تالاب کھود دیں۔ بارش کے موسم میں تالاب بھر جائے گا اور ہم خشک سالی سے محفوظ رہیں گے۔

یہ تجویز سب جانوروں نے منظور کر لی۔ دوسرے روز تالاب کھودنے سے پہلے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہر جانور باری باری کھودنے کا کام کرے اور یہ بھی طے کیا گیا۔ چونکہ بھیڑیے اور گیدڑ کی یہ مشترکہ تجویز تھی۔ لہذا سب سے پہلے بھیڑیا کام کرے اور سب کے بعد گیدڑ ـــــ کھدائی شروع کی گئی۔ اور جب آخر میں گیدڑ کی باری آئی تو وہ غائب تھا۔

چونکہ تالاب تقریباً مکمّل ہو چکا تھا۔ اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ گیدڑ کے بغیر ہی کام کر لیا جائے۔ چند روز کے بعد موسلا دھار بارش ہوئی۔ تالاب صاف اور میٹھے پانی سے لبالب بھر گیا۔ پھر جانوروں نے یہ قانون بنا دیا کہ اس تالاب سے پانی پینے کی اجازت اُسے ہی ہے جس نے کھُدائی میں مدد کی تھی۔

پاس ہی جھاڑیوں میں چھُپا ہوا گیدڑ یہ سُن رہا تھا۔ دوسرے روز

بہت سویرے گیدڑ تالاب پر آیا اور خوب جی بھر کر پانی پیا۔ پھر اس نے اپنا یہ معمول بنا لیا کہ جانوروں سے بہت پہلے تالاب پر آتا اور چوری چوری پانی پی کر بھاگ جاتا۔ چند دنوں کے بعد وہ اتنا دلیر ہو گیا کہ ایک صبح نہ صرف اس نے پانی پیا بلکہ تالاب میں نہاتا رہا۔ جب باقی جانور تالاب پر آئے تو انھوں نے پانی کو گندلا پایا۔

"یہ کس نے کیا ہے؟" شیر غرایا۔

"یہ کس کی شرارت ہے؟ چیتا چیخا۔

"یہ کون ہے؟" سب جانور ایک دوسرے سے پوچھنے لگے۔ مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ کس کا جُرم ہے۔

"میں آپ کو بتاتا ہوں کہ مجرم کو پکڑنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے" کچھوے نے کہا "میری پشت پر موم لیپ دیجیے اور میں ساری رات تالاب کے کنارے بیٹھ کر چور کا انتظار کروں گا اور اس بدمعاش کو ضرور پکڑ لوں گا۔"

کچھوے کے خول پر اچھی طرح موم کی تہہ جما دی گئی۔ اور کچھوا تالاب کے کنارے بیٹھ کر چور کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے اپنا سر، دُم اور پاؤں خول میں چھپا لیے۔ اس طرح وہ گہرے خاکستری رنگ کا ایک پتھر دکھائی دیتا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد وہ اپنا سر خول سے باہر نکال کر اِدھر اُدھر جھانکتا۔ کہ کہیں کوئی آ تو نہیں رہا۔ ساری رات انتظار کرنے کے بعد اُسے جھاڑیوں میں کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ کچھوا جلدی سے

تالاب کے کنارے کھسک گیا۔ اور اپنے پاؤں، سر اور دُم کو خول میں چھپا کر پتھر کی مانند بے حس و حرکت بیٹھ گیا۔

اتنے میں گیدڑ جھاڑیوں سے باہر نکلا اور اپنے گرد و پیش اچھی طرح دیکھ کر اس نے اطمینان کر لیا کہ کوئی تالاب پر پہرہ تو نہیں دے رہا۔

"پاؤں رکھنے کے لیے یہ کتنا اچھا پتھر ہے"۔ گیدڑ نے سوچا اور اپنے اگلے دو پاؤں کچھوے کے خول پر رکھ دیے۔ اپنی گردن کو جھکا کر پانی پینے ہی لگا تھا کہ اسے کچھ محسوس ہوا وہ گھبرایا اور پریشان بھی ہوا کہ اس کے دونوں پاؤں پتھر پر جم گئے ہیں۔

"آ — اُو — آ اُو — مجھے جانے دو۔ یہ ذلیل چال ہے"۔ گیدڑ چیخا۔

"صرف تم ہی دھوکا دینا نہیں جانتے"، کچھوے نے کہا۔ اور ساتھ ہی تالاب کے کنارے سے ہٹنے لگا۔

"پہیا پہیا — مجھے جانے دو"۔ گیدڑ پھر چیخا۔ "اگر تم نے مجھے جانے نہ دیا تو میں اپنی پچھلی ٹانگوں سے تمھارے خول کے پرخچے اُڑا دوں گا۔"

"جو جی میں آئے کرو"، کچھوے نے جواب دیا۔ اور تالاب سے دُور ہٹ گیا۔

گیدڑ نے پورے زور سے اپنا پچھلا پاؤں خول پر مارا۔ اور اس کے بعد دوسرا پاؤں بھی مار دیا۔ اس طرح اس کے چاروں پاؤں خول پر جم گئے۔

"دُو۔ دُو مجھے جانے دو"۔ گیدڑ غرّایا۔ "اگر اب بھی تم نے مجھے جانے نہ دیا تو اپنے دانتوں سے تمھارے دو ٹکڑے کر دوں گا۔"

"کوشش کرو ــــ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے"۔ کچھوے نے بڑے اطمینان سے جواب دیا اور اپنی راہ چلتا گیا۔ گیدڑ نے زور سے خول پر دانت مارے۔ اور اس کا جبڑا ابھی اس پر جم کر رہ گیا۔ اس طرح کچھوا گیدڑ کو اپنی پشت پر لاد کر شیر کے گھر لے گیا اور شیر کو سارا ماجرا کہہ سنایا کہ کس طرح اس نے چور اور دھوکے باز گیدڑ کو گرفتار کیا ہے۔

جب جانوروں نے یہ خبر سُنی تو سب گیدڑ کو دیکھنے کے لیے وہاں جمع ہو گئے۔ کسی نے بھی گیدڑ کی اس حالت پر رحم نہ کھایا۔ بلکہ ہر ایک نے یہ رائے ظاہر کی کہ گیدڑ کو بد دیانتی اور فریب دہی کے جرم میں سزائے موت دی جائے۔

"تمھاری زندگی کل تک ہے" شیر نے کہا۔ "ہم تم سے اتنی رعائت کر سکتے ہیں کہ تم خود ہی اپنی موت کا طریقہ منتخب کرو"۔

"آپ کا شکریہ"۔ گیدڑ نے مُردہ سی آواز میں کہا اور پھر سوچ میں پڑ گیا کہ کیا کوئی ایسا طریقہ ہو سکتا ہے جس سے جان بچ سکے۔

دوسرے روز سب جانور گیدڑ کی سزائے موت کو دیکھنے مقرّرہ جگہ پر پہنچ گئے۔ بھیڑیے کو جلاّد بنایا گیا۔

"کیا تم فیصلہ کر چکے ہو کہ تمھیں کس طرح ہلاک کیا جائے؟" شیر نے پوچھا

"میں نے ایک دفعہ بندر کو چوہا ہلاک کرتے دیکھا تھا۔ اس نے چوہے کو دُم سے پکڑ کر گھمایا اور پھر درخت کے تنے پر زور سے دے مارا۔ میں ایسی ہی موت مرنا چاہتا ہوں"۔ گیدڑ نے جواب دیا۔

"اگر مجھے اتنی آزادی حاصل ہو کہ میں ایک اور تجویز پیش کروں"۔
"ہاں کہو"۔ شیر نے کہا۔
"مجھے یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ آپ سب یہاں سے دُور دُور کھڑے ہو جائیں۔ کیونکہ جب بھیڑیا گھما کر مجھے پھینکے گا تو ممکن ہے کہ میں درخت کی بجائے آپ پر گر پڑوں اور یہ میری بڑی بدقسمتی ہو گی"۔
جانوروں نے اس تجویز کو منظور کر لیا اور درخت سے دُور جا کر بیٹھ گئے۔ یہاں سے وہ گیدڑ کی سزا کو اچھی طرح دیکھ سکتے تھے۔
رات کو کھانے کے لیے گیدڑ کو جو گوشت دیا گیا تھا، اس نے گوشت سے چربی بچا رکھی تھی اور صبح ہوتے ہی چربی اپنی دُم پر لگا دی۔ اور اب اس کی دُم مکھن کی گولی کی مانند چکنی ہو گئی تھی۔
بھیڑیا آگے بڑھا اور گیدڑ کو دُم سے پکڑ کر پورے زور سے اپنے سر کے اوپر گھمانے لگا۔ جتنی تیزی سے وہ اسے گھماتا اتنی ہی تیزی سے اس کی گرفت سے دُم پھسلنی شروع ہو گئی۔ انتہائی کوشش کے باوجود بھیڑیا دُم کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ اور اس سے پہلے کہ اسے معلوم ہوتا کہ کیا ہوا ہے۔ گیدڑ دُور زمین پر صحیح سلامت جا گرا۔ گرتے ہی اٹھا اور اپنی جان بچا کر جنگل میں غائب ہو گیا۔
چونکہ بھیڑیے کی گرفت سے اچانک گیدڑ کی دُم نکل گئی تھی اس لیے وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور دھم سے درخت کے تنے سے ٹکرا گیا۔
دُور بیٹھے جانور اس واقع سے اتنے حیران ہوئے کہ ان میں سے ایک

بھی گیدڑ کے تعاقب میں نہ دوڑا۔

اس دن کے بعد پھر کبھی گیدڑ تالاب پر نہیں آیا۔ مدتیں گزر گئیں۔ تالاب کے بنانے والے جانور مر کھپ گئے۔ مگر اب بھی سب جانوروں کو اس تالاب کا پتہ ہے۔ اور وہ اپنی پیاس بجھانے اس تالاب پر آتے ہیں۔ مگر کچھوا گیدڑ کا جرم نہ بھلا سکا۔ اور آج بھی تالاب کے کنارے ساری رات بیٹھا رہتا ہے۔ تاکہ کوئی پانی کو گندا نہ کر دے۔

امریکہ

ریڈ انڈین

۱۔ وعدہ خلافی
۲۔ رُوحوں کا جزیرہ

شمالی امریکہ اور کینیڈا کے اصل باشندے ریڈ انڈین کہلاتے ہیں ۔ سترھویں صدی میں یورپ سے پناہ گزینوں نے انھیں تقریباً نابود کر دیا ہے۔ اوراب شمالی امریکہ کا تمدّن وتہذیب مغربی ہے۔ لیکن ریڈ انڈین جو نیم خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کا اپنا مخصوص کلچر تھا۔ اور یہ کلچر ان کی لوک کہانیوں میں ملتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی لوک کہانیاں ہی ان کی نظریاتی زندگی کا واحد ذریعہ ہیں ۔

وعدہ خلافی اور روحوں کا جزیرہ، ریڈ انڈین لوگوں کی بہترین کہانیاں ہیں ۔ جو ان کے تصوّرات کی مجمل تصویر کشی کرتے ہیں۔

وعدہ خلافی

مدت گزری، ایک بہادر اور نیک دل انڈین کا جی دنیا کی دھوکہ بازی فریب، کمینگی اور غداری سے بیزار ہو گیا۔ اور آخر وہ سوچ سوچ کر اس نتیجے پر پہنچا کہ دنیا سے کنارہ کش ہو جائے۔ لہذا اس نے اپنے بیوی بچوں کو لیا اور آبادی سے دُور ایک گھنے جنگل میں پہنچ گیا۔ وہاں اس نے ایک مناسب جگہ پر چمڑے کا خیمہ نصب کیا اور بڑی سادہ زندگی بسر کرنے لگا۔ وہ جنگلی جانوروں کا شکار کرتا۔ ان کا گوشت خوراک اور کھالیں کنبے کے تن ڈھانپنے کے کام آتیں۔ وہ اپنے خیمے سے باہر تب ہی نکلتا جب کہ انھیں خوراک کی ضرورت پیش آتی۔ ورنہ خیمے میں چپ چاپ اپنے مالک سے لو لگائے بیٹھا رہتا۔ یونہی وقت گزرتا گیا۔

ایک روز یہ بہادر شکاری بیمار پڑ گیا۔ جب اس نے محسوس کیا کہ اس کی زندگی کے دن پورے ہو گئے ہیں۔ تو اس نے اپنے بیوی بچوں کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔

"بیوی! تم آٹھ چاند دیکھنے کے بعد میرے پاس آجاؤ گی۔ اس لیے مجھے تمھاری چنداں فکر نہیں۔ لیکن میرے بچو! تمھاری زندگی تو اب شروع ہو رہی ہے۔ فریب، جھوٹ، ظلم، خود غرضی اور غداری جس سے میں بھاگ کر یہاں پناہ گزیں ہوا تھا، ان سے تمھیں واسطہ پڑے گا۔ خیر اگر تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم ہمیشہ محبت سے رہو گے تو میں سکون سے جان دوں گا۔ اور خاص طور پر یہ وعدہ کرو کہ تم اپنے سب سے چھوٹے بھائی کو کبھی بھی نہ چھوڑو گے۔"

"کبھی نہیں"۔

اس کے بڑے بیٹے اور بیٹی نے ننھے بھائی کا ہاتھ پکڑ کر وعدہ کیا۔ اس کے بعد وہ بہادر اور نیک دل شکاری اطمینان سے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

ابھی آٹھ چاند بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ اس بہادر شکاری کی بیوی بیمار پڑ گئی۔ اس نے اپنے بچوں کو بلایا۔ اور کہا:

"تمھارے باپ کا پیغام مجھے آگیا ہے۔ اب میں چند دن اور زندہ ہوں لیکن مرنے سے پہلے میں تم سے ایک بار پھر وعدہ لینا چاہتی ہوں کہ تم اپنے ننھے بھائی کو بے آسرا نہیں چھوڑو گے۔ اور جب تک تم زندہ رہو گے

اس کا خیال رکھو گے"۔

بڑے بھائی اور بہن نے اپنی ماں سے وعدہ کیا کہ وہ آخر دم تک والدین کے حکم پر پابند رہیں گے اور چند روز کے بعد ان کی ماں بھی اس دُنیا سے سدھاری۔

جب تک برف گرتی رہی انھوں نے اپنے ننھے بھائی کا بڑا خیال رکھا۔ اس کی دیکھ بھال میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ پھر برف پانی ہونا شروع ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ چاروں طرف ہریالی چھا گئی۔ اور تب بڑے بھائی کا جی اُداس رہنے لگا۔ اس کے من میں خواہشات کا طوفان اُمڈ آیا۔ وہ ہر سمے اپنے قبیلے اور گاؤں کے دھیان میں مگن رہتا۔ جہاں اس کے والد نے اپنا بچپن اور جوانی کے ایام بسر کیے تھے اور آخر ایک روز اس نے بہن سے اپنی خواہش کا ذکر کیا۔

"میرے بھائی"۔ بہن نے جواب دیا۔ "لوگوں سے ملنے کی عادت کو میں اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ مگر آپ کو والد کے آخری الفاظ اور اپنے وعدے کو بھولنا نہیں چاہیے۔ ہمیں جوانی کی امنگ اور خوشی حاصل کرنے کی جستجو میں چھوٹے بھائی کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہی ہمارا فرض ہے"۔

لیکن بھائی نے بہن کی ان باتوں پر کوئی توجہ نہ دی۔ اور بغیر جواب دیے اپنا تیر کمان اٹھائے خیمے سے باہر نکل گیا۔

آہستہ آہستہ ہریالی پر کہر کی پتلی چادر سی پڑنے لگی۔ اس کے بعد برف گرنا شروع ہو گئی اور چاروں طرف برف کی سفیدی چھا گئی۔ یہ سفیدی

آہستہ آہستہ مٹنا شروع ہوئی۔ اور ہریالی پھر نمودار ہوئی۔ لیکن بڑا بھائی واپس نہ آیا۔ اور پھر بہن کا دل بھی سخت اور سرد ہونے لگا۔ اس کی آنکھوں میں چھوٹا بھائی خار کی طرح کھٹکنے لگا۔ اور وہ ننھے بھائی کو اپنے من پر ایک بوجھ سمجھنے لگی۔ آخر ایک روز اُس نے چھوٹے بھائی سے کہا "دیکھو ننھے! کئی دنوں کی خوراک موجود ہے۔ تم خیمے سے باہر نہ نکلنا۔ مَیں بڑے بھائی کی تلاش میں جا رہی ہوں۔ اسے لے کر جلد ہی واپس آ جاؤں گی"۔

دشوار گزار راستوں پر طویل سفر کرتے ہوئے وہ اپنے قبیلے میں پہنچی تو اس نے دیکھا کہ اس کا بڑا بھائی ایک نوجوان لڑکی سے شادی کر چکا ہے۔ اور بڑے مزے کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

کئی نوجوانوں کی نگاہیں اس کا بھی تعاقب کرنے لگیں اور ایک منچلے نوجوان نے آگے بڑھ کر اسے شادی کا پیغام دیا اور وہ جلد ہی اس سے شادی کرنے پر رضامند ہو گئی۔ شادی کے بعد وہ اپنے چھوٹے بھائی کو بالکل بھول گئی۔

دوسری طرف جب خیمے میں خوراک ختم ہو گئی تو چھوٹا بھائی خیمے سے باہر نکلا اور خوراک کی تلاش میں مارا مارا پھرنے لگا۔ شکار وہ کر نہیں سکتا تھا۔ اس لیے وہ جنگلی پھل اور پتے کھانے پر مجبور ہو گیا۔ اس طرح جوں توں کر کے وقت گزارتا رہا۔ موسم بہار ختم ہو گیا۔ لیکن پھر بھی اس کی بہن واپس نہ آئی۔ لڑکا بہت ڈرا۔ چند روز کے بعد برف گرنا شروع ہو گئی۔ یخ بستہ ہوا جسم کو منجمد کرنے لگی۔ پھٹے ہوئے خیمے میں ہوا خوفناک سیٹیاں بجا کر گزرتی۔ وہ ڈر کر پاس ہی ایک درخت کے کھوکھلے تنے میں چھپ گیا۔

رات کو بھیڑیے کہیں سے شکار مار کر لائے اور اس درخت کے نیچے کھانے لگے۔
لڑکا درخت کے تنے میں خوف سے کانپتا رہا۔

پو پھٹتے ہی بھیڑیے بھاگ گئے۔ لڑکا تنے سے باہر نکلا اور ان کا چھوڑا ہوا گوشت کھانے لگا۔ اس کے بعد اس کا یہ معمول ہو گیا کہ تمام رات تنے میں چھپا رہتا اور صبح کو جب بھیڑیے وہاں سے بھاگ جاتے تو ان کی چھوڑی ہوئی ہڈیاں اور گوشت کھاتا۔ آہستہ آہستہ بھیڑیے اس سے مانوس ہونے لگے۔ اور ہر صبح اس کے لیے گوشت اور ہڈیاں چھوڑنے لگے۔ لڑکے نے موسم سرما اسی طرح گزارا۔

برف پگھلنے لگی۔ موسم بہار شروع ہوا تو بھیڑیے جھیل کی طرف اترنے لگے۔ لڑکا بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

ایک روز بڑا بھائی اسی جھیل میں چھوٹی کشتی میں بیٹھا مچھلیاں پکڑ رہا تھا کہ اسے آواز آئی۔

میرے بھائی ــــ میرے بھائی، میں بھیڑیا بن رہا ہوں۔ بھیڑیا بن رہا ہوں ــــ میرے بھائی۔

ساتھ ہی فضا میں بھیڑیے کی مانند ایک طویل چیخ گونجی۔ یہ سن کر بڑے بھائی کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ بے تحاشا اس آواز کی سمت دوڑا۔ اور روتے ہوئے چلایا۔

"میرے ننھے بھائی۔ میرے پاس آؤ۔"

مگر اس کا چھوٹا بھائی نصف بھیڑیا بن چکا تھا۔ اس نے کوئی جواب

نہ دیا۔ بلکہ یہی کہتا رہا۔

"میرے بھائی۔ میرے بھائی! میں بھیڑیا بن رہا ہوں۔"

بھیڑیا بن چکا ہوں۔ میرے بھائی ——

جتنی بلند آواز میں بڑا بھائی چلاتا۔ ننھے بھائی۔ میرے ننھے بھائی۔ میرے پاس آؤ۔" اتنی ہی تیزی سے وہ بھیڑیوں کے پیچھے بھاگنے لگا۔ اس کے جسم پر بھیڑیوں جیسے بال بڑھ آئے اور وہ چوپاؤں کی مانند بھاگنے لگا۔ آخر اس نے ایک بڑی طویل چیخ لگائی اور بھیڑیوں کے ساتھ جنگل میں غائب ہوگیا۔

بڑے بھائی کا دل ٹوٹ گیا۔ وہ اپنی رُوح میں مایوسی اور افسوس کا بوجھ لیے گاؤں واپس گیا۔ اور بہن سے یہ واقعہ بیان کیا۔ دونوں اپنی زندگی کے آخری سانس تک اپنے چھوٹے بھائی کا سوگ مناتے۔ اور وعدہ خلافی پر آنسو بہاتے رہے۔

رُوحوں کا جزیرہ

مدت ہوئی شمالی امریکہ میں ریڈ انڈین کے ایک قبیلے میں ایک ایسی حسین لڑکی تھی جو اپنے حسن میں ثانی نہیں رکھتی تھی۔ قبیلے کے کئی بہادر اس سے شادی کے خواہش مند تھے۔ لیکن وہ صرف ایک نوجوان کی طرف متوجہ تھی۔ اور یہ خوش نصیب نوجوان اس قبیلے کا نوجوان تھا جو چند سال پہلے اسے پسند کر چکا تھا۔ ان کی شادی کا فیصلہ بھی ہو چکا تھا۔ یہ تقریب منانے کے لیے شاہانہ جشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ہر شخص شادی کے دن کا منتظر اور یہ دونوں آنے والی

مسرت کے خیال میں مگن تھے۔ لیکن عین شادی کی دعوت سے ایک رات پہلے اچانک لڑکی بیمار ہوگئی اور اپنی سہیلیوں سے ایک لفظ کہے بنا جو اس کے گرد بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے اس دُنیا سے چل بسی۔

اس کے محبوب کا دل ٹوٹ گیا اور وہ دن رات اس کے خیال میں ڈوبا رہتا۔ اس نے اپنا تیر کمان ایک طرف رکھ دیا۔ وہ شکار کھیلنے جاتا اور نہ ہی لڑنے۔ بلکہ صبح سے لے کر شام تک جہاں لڑکی دفن کی گئی تھی، بیٹھا اپنی دفن شدہ مسرت کے متعلق سوچتا رہتا۔ آخر کار کئی روز کے بعد تاریکی میں اسے روشنی کی ایک کرن دیکھی۔ اسے یاد آیا کہ قبیلے کے بزرگ کہا کرتے تھے کہ روحوں کے جزیرے کو ایک راستہ جاتا ہے۔ اگر اس کی تلاش کی جائے تو وہ راستہ مل سکتا ہے۔

دوسرے روز وہ بہت سویرے اٹھا اور اس نے اپنے تھیلے میں کچھ خوراک رکھی اور ایک فالتو کھال اپنے کندھے پر ڈالی۔ کیونکہ اسے معلوم نہ تھا کہ سفر کتنا طویل ہوگا اور اسے کتنی مدت گھر سے دُور رہنا پڑے گا۔ اور اسے کن علاقوں میں گزرنا پڑے گا۔ البتہ اسے یہ یقین تھا کہ اگر واقعی روحوں کے جزیرے کی طرف کوئی راستہ جاتا ہے تو وہ اسے پالے گا۔ سفر پر جانے سے پہلے اسے ایک پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کس

سمت روانہ ہوا ورنہ اسے کوئی ایسی وجہ معلوم ہوتی تھی کہ وہ ایک سمت کو دوسری سمت پر ترجیح دے۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ اسے اچانک خیال آیا کہ ایک بزرگ کو یہ بھی کہتے سُنا گیا تھا کہ روحوں کا جزیرہ جنوب کی سمت ہے۔ اب وہ ایک نئی امّید اور نئے حوصلے سے جنوب کی سمت روانہ ہوا۔

کئی میلوں کی مسافت طے کرنے کے بعد بھی اسے اپنے گرد و پیش کوئی تبدیلی نظر نہ آئی۔ جنگل، پہاڑ اور دریا ایسے ایسے ہی نظر آ رہے تھے جیسے وہ اپنے علاقے میں دیکھنے کا کا عادی تھا۔ البتہ ایک چیز کا فرق اس نے ضرور محسوس کیا کہ جب وہ اپنے سفر پر نکلا تھا تو اس وقت درختوں اور پہاڑوں پر برف کی موٹی تہ جمی ہوئی تھی۔ لیکن جوں جوں وہ جنوب کی طرف بڑھتا تھا، برف کم ہوتی جا رہی تھی۔ حتّیٰ کہ وہ ایسے مقام پر پہنچ گیا۔ جہاں برف کا نام و نشان نہ تھا۔ درختوں اور پودوں پر غنچے چٹخنے لگے۔ اور پھر اس کے پاؤں میں پھول ہی پھول بکھر گئے۔ اس کے سر پر بادلوں کی بجائے شفّاف نیلا آسمان تھا اور ہر طرف پرندے چہچہا رہے تھے۔ اور تب اسے یقین ہو گیا کہ وہ صحیح راستے پر گامزن ہے۔

اپنی کھوئی ہوئی محبوبہ کو دیکھنے کے خیال ہی سے
اس کا دل خوشی سے کانپ اٹھا اور وہ تیز تیز قدم
اٹھاتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ کبھی اس کا راستہ تاریک
جنگل سے گزرتا اور کبھی دشوار گزار پہاڑیوں سے ——
بہت دور ان پہاڑیوں کی چوٹی پر ایک جھونپڑی نظر
آئی۔ ایک ضعیف شخص کھال کی ایک پوشش پہنے
اور ایک ہاتھ میں عصا لیے جھونپڑی کے دروازے پر
کھڑا تھا۔ جب نوجوان اس کے پاس پہنچا اور اپنا ماجرائے
سفر بیان کرنے لگا۔ تو بوڑھا بول اٹھا۔
"میں تمھارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ مجھے معلوم ہے
جہاں سے تم آ رہے ہو۔ اور جس کی تلاش میں تم
یہاں پہنچے ہو۔ وہ ابھی ابھی یہاں سے گئی ہے۔ تم
میری اس جھونپڑی میں کچھ سستا لو۔ جیسا کہ وہ بھی
یہاں آرام کر کے گئی ہے۔ تمھارے سوالات کے جوابات
دوں گا۔ اور تمھیں بتاؤں گا کہ اب تمھیں کس طرف
جانا چاہیے۔"
یہ سن کر نوجوان سردار جھونپڑی میں داخل ہوا۔
لیکن اس کا دل اپنی محبوبہ سے ملنے کے لیے اتنا
بے چین تھا کہ وہ آرام نہ کر سکا اور جلد ہی اُٹھ

کھڑا ہوا۔ ساتھ ہی بوڑھا بھی اٹھ کر دروازے پر جا کھڑا ہوا۔

"دیکھو!" بوڑھا بولا۔ "اس پھیلے ہوئے پانی پر نظر دوڑاؤ۔ پانی سے پرے زمین کا وہ ایک خطہ ہے یہی روحوں کا جزیرہ ہے۔ لیکن وہاں کوئی شخص داخل نہیں ہو سکتا۔ وہاں داخلے کی شرط یہ ہے کہ وہ اپنا جسم یہاں چھوڑ جائے۔ تمھیں جزیرے میں جانا ہے۔ تو اپنا جسم یہاں چھوڑ جاؤ۔ اور اپنا تیر کمان، اپنی کھال اور اپنا کتا بھی۔ یہاں یہ چیزیں محفوظ رہیں گی۔"

یہ کہہ کر وہ مڑا اور نوجوان سردار نے فوراً اپنے آپ کو ہوا کی طرح لطیف محسوس کیا۔ اور جب وہ جزیرے کی طرف بڑھا تو اس کے پاؤں زمین کو چھوتے نہ تھے۔ بلکہ وہ پرواز کر رہا تھا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتا تو فضا عطر بیز ہوتی گئی۔ اور پھول کچھ زیادہ ہی خوب صورت ہوتے گئے۔ جانور ڈرنے کی بجائے پیار سے اپنی تھوتھنیاں اس سے رگڑنے لگے۔ پرندے اس کے گرد چہچہانے لگے اور مچھلیاں پانی سے سر نکال کر اسے گزرتی ہوئی دیکھنے لگیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ یہ دیکھ کر بڑا حیران ہوا کہ چٹانیں اور درخت اس کے

راستے میں حائل نہ ہوتے تھے۔ بلکہ وہ ان میں سے بڑی آسانی سے گزر رہا تھا۔ درحقیقت یہ چٹانیں اور درخت اصل نہ تھے۔ بلکہ یہ ان کی روحیں تھیں۔ کیونکہ یہ روحوں کی سرزمین تھی۔

اس طرح وہ فضا میں پرواز کرتا ہوا ایک وسیع جھیل کے کنارے پہنچ گیا۔ اس جھیل کے وسط میں ایک خوبصورت جزیرہ تھا اور جھیل کے کنارے چمکیلے پتھر کی ایک کشتی کھڑی تھی۔ اور اس میں چمکتے ہوئے دو پتوار تھے۔

نوجوان اچھل کر کشتی میں بیٹھ گیا۔ اور پتواروں کو مضبوطی سے تھام کر کشتی کھینے لگا۔ کنارے سے تھوڑی دور پہنچ کر وہ دیکھتا ہے کہ بالکل اس کی کشتی کی مانند ایک کشتی بڑھ رہی ہے۔ اور اس میں اس کی محبوبہ بیٹھی ہے۔ جس کی خاطر اس نے اتنا طویل اور کٹھن سفر طے کیا تھا۔ لیکن وہ ایک دوسرے کے پاس پہنچ نہیں سکتے تھے۔ ان کی کشتیوں کے درمیان بڑی بڑی لہروں کا طوفان حائل تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہ زبردست لہریں کشتیوں کو غرق کر دیں گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ایک دم نوجوان اور لڑکی خوف سے کانپتے

ہوئے پیچھے ہٹے۔ کیونکہ شفاف پانی میں بہت نیچے انھیں ان لوگوں کی ہڈیاں نظر آئیں جو پہلے مر چکے تھے۔ اور ان لہروں کی مدّ و جزر میں کئی مرد اور عورتیں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ لیکن ان میں چند ہی خوش نصیب ایسے تھے جو پار اتر سکے۔ صرف بچّوں کو کوئی خوف نہ تھا۔ وہ بڑے آرام سے پار اتر رہے تھے۔ اس دہشت ناک منظر سے وہ بہت خوف زدہ ہوئے۔ تاہم انھیں کسی قسم کا کوئی گزند نہ پہنچا۔ کیونکہ ان کی زندگیاں بدی سے پاک تھیں۔

"زندگی کے مالک" نے کہا تھا کہ انھیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچے گا۔ آخر یہ بھی "جزیرۂ مسرت" میں پہنچ گئے اور وہ پھولوں کی خوش نما کیاریوں کے درمیان اور تیز رو ندیوں کے کنارے سیر کرتے رہے۔ انھیں بھوک اور پیاس کا مطلقاً احساس نہ رہا۔ اور نہ ہی سردی گرمی کا ـــــ ہوا ان کی خوراک تھی اور سورج کی روشنی ان کا لباس۔ وہ نعشوں کو بالکل بھول گئے۔ کیونکہ جزیرے میں کوئی قبر نہ تھی۔ نوجوان سردار کے خیالات جنگوں اور جانوروں کے شکار کی طرف نہ گئے۔ وہ دونوں بڑی خوشی سے ہمیشہ ہمیشہ اسی طرح ہاتھ

میں ہاتھ دیئے جزیرۂ مسرت میں پھرتے رہتے۔ اگر ہوا کی صرصراہٹ میں "زندگی کے مالک" کی آواز سُنائی نہ دیتی۔ "جہاں سے آئے ہو، وہاں واپس چلے جاؤ"۔ تمھارے کرنے کے لیے میرے پاس بہت کام ہیں اور قبیلے کے لوگوں کو تمھاری ضرورت ہے — کئی سال تک تم اپنے قبیلے پر حکمرانی کرو گے — دروازے پر میرا ایلچی تمھارا منتظر ہے۔ تم اس سے اپنا جسم واپس لے لو۔ وہی تمھیں بتائے گا کہ تمھیں کیا کرنا چاہیے۔ اس کا مشورہ غور سے سنو۔ اور صبر و تحمل سے انتظار کرو — اور آنے والے وقت میں تم اس سے ضرور مل سکو گے۔ جسے اب تمھیں چھوڑنا پڑے گا۔ لڑکی کو اس جگہ قبول کر لیا گیا ہے وہ ہمیشہ کے لیے نوجوان اور حسین رہے گی۔ جیسا کہ وہ اس وقت تھی۔ جب میں نے اسے برف کی سرزمین سے بلایا تھا۔"

ہانز کرسچین اینڈرسن

ترجمہ ریاض جاوید

اینڈرسن کی کہانیاں

انگریزی ادب میں "ہانز کرسچین اینڈرسن" نے جہاں معصوم بچّوں اور بچیوں کے لیے ننھی منّی اور دل کش کہانیاں لکھی ہیں وہاں بڑوں کو بھی پرستانوں کی سیر کرائی اور ان کا محبوب مصنّف بن گیا۔

لیکن ——— پرستانوں کی اس سیر میں بھی اس نے کوئی نہ کوئی خاص مقصد پیشِ نظر رکھا ہے۔ دلچسپی اور ہر دلعزیزی پیدا کرنے کے لیے حسن وعشق کے نازوانداز بھی بڑے خوبصورت طریقے سے بیان کیے ہیں، جس سے اس کی کہانیاں دُنیا کی کہانیوں میں نہ صرف انفرادیت رکھتی ہیں بلکہ انھیں فوقیت بھی حاصل ہے۔

ریاض جاوید نے ان کا ترجمہ کرنے میں جس بالغ نظری کا ثبوت دیا ہے وہ قارئین سے پوشیدہ نہ رہے گا۔ ہم صرف اتنا کہے بغیر نہ رہیں گے کہ انھوں نے ان کہانیوں کو افسانے کی زبان میں پیش کرکے دو آتشہ کا لطف پیدا کر دیا ہے۔

قیمت دو روپے

کتاب منزل۔ لاہور